رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

نگار

نرخنامہ اجرت اشتہار

ایک سال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ - ۱۰۰ روپیہ	۵۰ روپیہ	۲۵ روپیہ	۱۰ روپیہ
آدھ صفحہ - ۵۰ "	۲۵ "	۱۳ "	۸ روپیہ
چوتھائی صفحہ ۲۵ "	۱۳ "	۷ "	۴ روپیہ

اُردو شاعری

یعنی جنوری ۳۵ء کا نگار جس میں اُردو شاعری کی تاریخ، اسکی عہد بعہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعراء پر بسیط نقد و تبصرہ کیا گیا ہے مع انتخاب کلام، اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی - اور جس میں بیاسات مضامین اڈیٹر نگار کے لکھے ہوئے ہیں۔ حجم ۲۵۰ صفحات۔ قیمت عمر علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری ۳۶ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اسکے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے اس میں تمام مشہور ہندو شعراء کے کلام کا انتخاب مع ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت علاوہ محصول ہر

نگار بک ایجنسی

تصانیف نیاز فتحپوری

ملنے کا پتہ منیجر نگار لکھنؤ

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت دو روپیہ (عمر)
علاوہ محصول۔

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۲۳ افسانے و مقالے درج ہیں۔ زبان، قدرت بیان کی تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے

قیمت چار روپیہ (للعہ)
علاوہ محصول۔
خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے - جذبات نگاری، اور سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فنِ انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں مع تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شائع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے
علاوہ محصول۔

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)
علاوہ محصول۔

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہو جاتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)
بیرون ہند سے بارہ شلنگ آٹھ روپیہ (سے) سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد (۳۱) | فہرست مضامین اپریل ۱۹۳۷ء | شمارہ (۴)

ملاحظات		۲
شعر اور عورت	سید جلیل الرحمان اعظمی	۹
ہماری بت پرستیاں	ہوش بلگرامی	۱۹
مکتوبات نیاز		۳۱
لامذہبیات		۳۵
دوا فروش کی بیوی	ابوالفتح سرمد	۴۵
ضیاء بدایونی اور مومن	تنویر قادری	۵۱
ایک لاسلکی ڈرامہ		۶۳
باب المراسلۃ والمناظرہ		۷۱
باب الاستفسار		۷۳
عجائب و غرائب		۷۹

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

معاون:- جلیل الرحمان اعظمی

جلد (۳۱)	اپریل ۳۷ء	شمار (۴)

ملاحظات

تاثرات دکن

میں ۲۱ر فروری سے ۵ر مارچ تک حیدر آباد میں رہا۔ یہ زمانہ شہریار دکن کی تقریبات سلور جوبلی کے لئے مخصوص تھا، جن کی غیر معمولی نوعیت پر گزشتہ ماہ کے ملاحظات میں مختصراً اظہار خیال کر چکا ہوں۔ اس ماہ کے نگار میں مختصراً میں اپنے ان تاثرات و توقعات کو قلمبند کرنا چاہتا ہوں جو حیدر آباد کے حال و مستقبل سے متعلق ہیں۔

حیدر آباد ہندوستان ہی کی ایک ریاست ہے اور چونکہ ریاستوں کے متعلق ایک عام خیال قایم ہو چکا ہے کہ وہاں سوائے بدنظمی اور بدتمیزی کے اور کچھ نہیں ہوتا اس لئے ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات حیدر آباد کی نسبت بھی یہی گمان رکھتے ہوں، لیکن جن کو وہاں جانے اور حالات مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ حیدر آباد کیا چیز ہے اور دوسری ریاستوں کے حالات اس پر منطبق کرنا کسقدر غلط ہے۔

قطع نظر اس سے کہ حیدر آباد کی ریاست اپنے رقبہ کے لحاظ سے بعض مغربی سلطنتوں سے بھی

زیادہ وسیع اور بہ لحاظ آبادی افغانستان و مصر سے زیادہ بڑی ہے، اس کی اہمیت زیادہ تر اس حقیقت سے وابستہ ہے کہ وہ مغلیہ حکومت کی تنہا یادگار ہے اور اس لحاظ سے تمام اسلامی ہند کو ایک مرکز اجتماع پر لانے کی اہلیت رکھتی ہے۔ پھر یہ حقیقت اگر ایک طرف حکومت ہند کے نزدیک مسلم ہے تو دوسری طرف خود یہاں کے فرمانرواؤں نے بھی اس کو کبھی نظر انداز نہیں کیا اور اسلامی تہذیب و کلچر کا معیار قایم رکھنے میں انھوں نے ہمیشہ بیش از بیش سعی سے کام لیا۔

تعلیمات اسلامی کا یہ مقصود کبھی نہیں رہا ہے کہ انسان صرف رکوع و سجود پر قناعت کرکے خاموش بیٹھ رہے یا صوم و صلوٰۃ کے ذریعہ سے توشۂ آخرت حاصل کرنے کو تنہا نصب العین قرار دیکر دنیاوی ترقیوں کی طرف سے روگردانی اختیار کرلے۔ بلکہ اسلام کا مدعا ہمیشہ حقایق کی جستجو اور نوامیس فطرت کی تلاش رہا ہے اور اس سلسلہ میں اس نے سب سے پہلے دنیاوی فوز و فلاح حاصل کرنے کی تعلیم دی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں تمام انسانی دعاؤں کا خلاصہ اس ایک آیت میں جمع کردیا ہے:۔

"ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ و قنا ربنا عذاب النار"

جس میں سب سے پہلے اسی دنیا کی بھلائیوں اور ترقیوں کی خواہش کی گئی ہے اور اس کے بعد آخرت یعنی ان ترقیوں کے قیام و بقا کی۔ کیونکہ ایک انسان کے لئے اس سے زیادہ عذاب جہنم اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ وہ ذلت و نکبت کے ساتھ اس دنیا میں زندگی بسر کرے اور دوسروں کی محکوم ہوکر رہے۔

پھر اس رمز کو تمام فرمانروایان دکن اور خصوصیت کے ساتھ آصف جاہ سابع نے جس تکمیل کے ساتھ سمجھا ہے اس کا اندازہ صرف یوں ہو سکتا ہے کہ آپ عہد عثمانی پر غایرانہ نگاہ ڈالیں اور اسی کے ساتھ ان ارشادات و اقوال پر غور کریں جو وقتاً فوقتاً زبان مبارک سے ادا ہوتے رہتے ہیں۔

گزشتہ تقریبات جوبلی کے سلسلہ میں ایک دن علمار و مشایخ کے سپاسنامہ کے لئے بھی مخصوص تھا چنانچہ وہ سپاسنامہ یا دعانامہ پیش کیا گیا اور اس میں وہی سب کچھ تھا جس کی ایک دعا گو و دعا پیشہ طبقہ کی طرف سے توقع کی جا سکتی ہے یعنی اس میں شہریار دکن کی ان تمام خدمات کا ذکر ضرور تھا جن سے براہ راست یا کسی واسطہ سے کوئی نہ کوئی فایدہ اس جماعت کو بغیر کوئی کام کئے ہوئے پہنچتا رہتا ہے، لیکن ان حقایق کا کوئی ذکر نہ تھا جو بہ حیثیت ایک مدبر و سیاست داں فرمانروا کے اعلحضرت کے پیش نظر رہتے ہیں اور جن کا تعلق غالباً مذہب سے زیادہ صرف انسانیت و اخلاق سے ہے۔ چنانچہ اعلحضرت نے اس کو محسوس کیا اور اپنے جواب میں موجودہ گروہ علماء و مشائخ کے بیکار و مجہول ہونے کی طرف ایک نہایت لطیف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ قرآن پاک میں جن علمار کی تعریف کی گئی ہے ان میں آج کل بہت کمی محسوس کی جا رہی ہے

اور جس زمانہ میں ایسے علماء پیدا ہوتے تھے وہ اب باقی نہیں رہا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آصف جاہ سابع کے نزدیک منصب شہریاری کا کیا مفہوم ہے اور اگر گزشتہ ۲۵ سال کی ترقیوں پر نظر کی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اعلیحضرت نے اپنے عمل کے لحاظ سے بھی اس حد تک اسے پورا کر کے دکھا دیا ہے کہ مشکل ہی سے کوئی دوسری نظیر اس کی دنیا میں مل سکتی ہے۔

جس طرح ہم ایک گھر کی حالت دیکھ کر اس کے مالک کے ذوق کا پتہ چلا سکتے ہیں اسی طرح ہم ایک ملک کی حالت دیکھ کر اس کے فرمانروا کا حال معلوم کر سکتے ہیں۔ اگر ملک ترقی کر رہا ہے، رعایا خوشحال ہے، ذہنی ترقی کے ذرائع عام ہیں اور تہذیب و تمدن کے آثار نمایاں، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہاں کا فرمانروا بیدار مغز اور فرائض شناس ہے ورنہ ہم اس کے خلاف حکم لگانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ پھر اس بات میں نہ مجھے کہنے کی ضرورت ہے نہ آپ کو سننے کی، حیدرآباد جائیے اور دیکھئے کہ وہاں کا ایک ایک ذرہ اعلیحضرت کے غیر معمولی تدبر و فراست کا شاہد ہے اور وہاں کا نظم و نسق بتاتا ہے کہ یہاں کی عنان حکومت کسی نہایت ہی بلند فطرت رکھنے والے انسان کے ہاتھ میں ہے۔

ایک بادشاہ کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ملک کی دولت کا امین سمجھے اور اہل ملک ہی پر اسکو صرف کرے، اس کا حصہ اگر کوئی ہے تو صرف یہ احساس کہ اس نے اپنے ان فرائض کو پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کیا اور ضمیر کا یہ اطمینان ہی اس کی تمام خدمات کا سب سے بہتر معاوضہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ نہایت بلند بات ہے اور جاہ و ثروت کی دنیا میں اس کا وجود مفقود، لیکن دکن اور شہریار دکن یقیناً اس سے مستثنیٰ ہے اور وہیں پہونچکر ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ راعی و رعایا کے حقیقی تعلقات کا معیار کیا ہونا چاہئے، چنانچہ اعلیحضرت خود اپنے اس احساس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ:-

"میری کوششیں سب میری رعایا کی سود و بہبود کی خاطر صرف ہوتی ہیں اور جو کچھ دنیوی متاع مجھکو حاصل ہے وہ میری نہیں بلکہ بطور امانت میرے پاس رکھی ہوئی ہے۔ اگر کوئی چیز در حقیقت میری ذاتی ملک ہے، وہ فقط میرا نور ایمان اور جذبۂ قلبی ہے"

پھر ظل ہمایونی کا یہی وہ احساس ہے جس نے تمام ملک میں ایک عام بیداری پیدا کر دی ہے اور جس طرف دیکھئے آثار ترقی و حیات بکھرے نظر آتے ہیں۔

عہد عثمانی کو ابھی صرف ۲۵ سال کا زمانہ گزرا ہے اور کسی ملک یا قوم کی ترقی کے لئے یہ زمانہ کوئی چیز نہیں، لیکن اتنی ہی قلیل مدت میں جو انقلاب سلطنت دکن کے حالات میں رونما ہوا ہے، کسی دوسرے فرمانروا کے عہد میں اس کے لئے غالباً صدیاں درکار ہوتیں اور شاید پھر بھی یہ نتیجہ برآمد نہ ہوتا۔

تمدن و تہذیب کے لحاظ سے ہر ملک میں تین طبقے ہوا کرتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا ادنےٰ یا غیر تعلیم یافتہ طبقہ کہلاتا ہے جس میں مزدوری پیشہ اور کاشتکار وغیرہ شامل ہیں، دوسرا متوسط طبقہ ہے جو بہ لحاظ تعلیم زیادہ ترقی یافتہ لیکن اقتصادی حیثیت سے بہت کمزور ہوتا ہے، تیسرا طبقہ امراء کا ہے جن میں تعلیم کم، بد اخلاقی زیادہ ہوتی ہے اور جو سرمایہ داری کی ستم رانیوں کا مرکز ہے۔ چنانچہ حیدرآباد میں بھی یہ تینوں طبقے موجود ہیں لیکن ان کی حالت دوسرے مقامات کے لحاظ سے بہت مختلف ہے۔

عام طور پر ادنیٰ طبقہ اپنے اخلاق و اطوار کے لحاظ سے حد درجہ پست ہوا کرتا ہے، کیونکہ وہ تعلیم سے بے بہرہ ہوتا ہے اور مالی حالت اس کی حد درجہ سقیم ہوتی ہے، لیکن یہاں اس طبقہ کی اقتصادی حالت عام طور پر نہایت اچھی ہے اور نہ صرف یہ کہ وہ فقر و فاقہ کی مصیبت سے آزاد ہے بلکہ ایک حد تک مطمئن زندگی بسر کرنے کے ذرائع اپنے پاس رکھتا ہے، اس کا سبب صرف یہ ہے کہ زراعت پیشہ جماعت کے لئے تمام وہ آسانیاں فراہم کی جاتی ہیں جو جدید ترین اسباب فلاحت و زراعت سے متعلق ہیں اور صرف فطرت کے رحم پر اس کو نہیں چھوڑ دیا جاتا۔ ذرائع آبپاشی کی کثرت، اتحادی بنکوں کی افراط، اصول زراعت کی ترویج، مویشیوں کی حفاظت کا اہتمام اور خود مزارعین میں اصول حفظان صحت کی اشاعت، یہ وہ تمام باتیں ہیں جنھوں نے حیدرآباد کے طبقۂ مزارعین کو خوشحال بنا رکھا ہے اور جن کی بدولت وہ امن و سکون کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ رہا مزدوری پیشہ طبقہ سو اس کے اطمینان کا سبب یہ ہے کہ ریاست کے مختلف شعبوں نے رفاہ عام کے کام کثرت کے ساتھ جاری کر رکھے ہیں اور یہاں سے انھیں خاطر خواہ اجرت ملتی ہے

یہاں کا متوسط طبقہ اب سے چند سال قبل یقیناً اچھی حالت میں نہ تھا، لیکن جب سے تعلیمات کی جدید اسکیم کا نفاذ ہوا ہے اور جامعۂ عثمانیہ وجود میں آئی ہے اس وقت سے اس جماعت میں نمایاں ترقی ہو رہی ہے اور عام طور پر بیداری پیدا ہو گئی ہے۔ یہ شرف غالباً صرف سلطنت دکن ہی کو حاصل ہے کہ وہ اپنی آمدنی کا تقریباً آٹھواں حصہ اپنی رعایا کی تعلیم پر صرف کرتی ہے اور ملک کی تجارتی و صناعتی ترقی کے لئے ایک حکومت کے مساعی کا انتہائی معیار اس سے زیادہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ وہ ڈھائی کروڑ روپیہ کا محصول اس غرض کو سامنے رکھ کر معاف کر دے۔

جامعۂ عثمانیہ نے دکن کے نوجوانوں میں جو احساس خود اعتمادی پیدا کر دیا ہے اور ملک کے نظم و نسق کو وہ جس انداز سے آہستہ آہستہ سنبھال رہے ہیں، وہ نہایت عظیم الشان توقعات اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے۔

تیسرا طبقہ یہاں امراء کا ہے جن میں سے اکثر ریاست کے جاگیردار ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ عہد عثمانی سے قبل ان کی حالت بہت سقیم تھی اور کوئی جاگیر ایسی نہ تھی جو قرض کا بار نہ رکھتی ہو، لیکن اعلیحضرت نے

اپنے دورِ حکمرانی میں ان کی اصلاح حال کی طرف بھی خاص توجہ سے کام لیا اور تمام جاگیریں کورٹ کرکے اسوقت تک واگزاشت نہیں کیں جب تک ان کی مالی حالت اچھی نہیں ہوگئی۔ چنانچہ اس وقت غالباً حیدرآباد ہی کا طبقۂ امراء ایسا ہے جو قرض کی مصیبت کا شکار نہیں ہے اور جسے آیندہ اس بلا سے محفوظ رکھنے کے لئے خاص قوانین کا پابند بنا دیا گیا ہے۔ پھر چونکہ فرمانروائے وقت کی زندگی کا اثر سب سے زیادہ امراء کی جماعت پر پڑتا ہے، اس لئے ان میں بھی اپنی اپنی رعایا کی فلاح و بہبود اور عام تعلیمی و اقتصادی ترقی کا ذوق پیدا ہوگیا ہے اور جو خوشحالی ریاست کے اندر نظر آتی ہے وہی جاگیروں کے حدود میں بھی پائی جاتی ہے اور اس طرح گویا ادنیٰ طبقہ سے لیکر اعلیٰ طبقہ تک سب کے سب ایک ہی منزل کی طرف قدم اٹھا رہے ہیں اور ان سب کی راہنما وہی آصف جاہ سابع کی ذات گرامی ہے، جس کی زندگی کا واحد مقصود نفس کُشی اور جس کے آئین حکمرانی کا تنہا نصب العین دوسروں کی خدمت ہے۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومتوں کی بدنظمی کا سبب اکثر بیشتر فرمانروا کی ذات نہیں ہوتی بلکہ جماعت عمال ہوا کرتی ہے۔ یقیناً بادشاہ اپنے وسیع ملک کے ہر ہر گوشہ میں پہونچکر ہر ہر فرد کا مطالعہ نہیں کرسکتا اور نہ وہ تنہا ہر ہر شعبہ کی عاملانہ ذمہ داری اپنے سر لے سکتا ہے۔ اس لئے اگر فرمانروا اچھا ہے لیکن بدقسمتی سے اس کے کارکن بُرے ہیں تو بدنظمی بدستور قایم رہتی ہے اور ملک کوئی ترقی نہیں کرسکتا۔ لیکن اسکو آصفجاہ سابع کے حُسن نیت کا نتیجہ سمجھئے یا اس کی نگاہ مردم شناس، خوش قسمتی سے حیدرآباد کو کام کرنے والے بھی ایسے ملگئے جو اعلیحضرت کے مزاج شناس تھے اور جنھوں نے ذات شاہانہ کی تمام تدابیر حکمرانی کو بروئے کار لانے میں کوئی دقیقہ کوشش کا اُٹھا نہیں رکھا۔

یہاں کا آئین حکومت ایک کونسل سے متعلق ہے جو تمام شعبوں کی نگراں ہے اور جملہ اہم معاملات سمع اقدس تک پہونچانے کی ذمہ دار ہے۔ اعلحضرت کے عہد ہمایوں میں اس کونسل کی قابل ذکر صدارت اول اول سر علی امام کے سپرد ہوئی تھی اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اپنے زمانہ میں (گو وہ بہت مختصر تھا) اچھی طرح ثابت کردیا کہ وہ فرمانروائے وقت کے بلند ارادوں کی تکمیل کی پوری اہلیت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر اس منصب جلیل پر فائز ہوئے اور حیدرآباد میں کوئی ایک متنفس ایسا نظر نہ آئے گا جو مہاراجہ بہادر کے بلند و پاکیزہ اخلاق کا معترف نہ ہو۔ آپ کا تعلق طبقۂ امراء سے ہے اور اس میں شک نہیں کہ امراء دکن کی جو روایات سننے میں آئی ہیں وہ اس وقت صرف آپ کی ذات سے زندہ ہیں۔ اس کا اعتراف خود اعلحضرت نے بھی متعدد بار کیا ہے اور ساکنان حیدرآباد تو روز اس کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ آپ کی صدارت عظمیٰ کا زمانہ نہ صرف سکون و اطمینان بلکہ تمام ان ترقیوں کے لحاظ سے جو خسرو دکن کے پیش نظر ہیں،

بڑا سعید و مبارک زمانہ تھا اور تاریخ حیدر آباد میں آپ کے خدمات جلیلہ اور آپ کے اوصاف حمیدہ کو یقیناً زریں حروف سے لکھا جائے گا۔

کونسل میں صدارت عظمیٰ کے بعد سب سے زیادہ مہتم بالشان ہستی ممبر مالیات کی ہوا کرتی ہے، کیونکہ اگر ملک کے اقتصادیات کی نگہداشت کا اچھا انتظام نہ ہو تو پھر کسی قسم کی کوئی ترقی ممکن نہیں، اور میں اسے سلطنت دکن کی انتہائی خوش نصیبی قرار دوں گا کہ اسے سر اکبر حیدری ایسے غیر معمولی دل و دماغ کا انسان یہ عظیم الشان خدمت انجام دینے کے لئے میسر آگیا۔

سر اکبر حیدری بین الاقوامی شہرت رکھنے والے انسان ہیں اور ہندوستان کے اُن چند مخصوص نفوس میں سے ہیں، جنھوں نے اپنی شہرت و قابلیت صرف اپنے دل و دماغ کے زور سے تسلیم کرائی ہے۔ سر اکبر نے بہ حیثیت ممبر مالیات جو جلیل القدر خدمات انجام دی ہیں ان کی تفصیل کے لئے حقیقتاً دفتر کے دفتر ناکافی ہیں مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ ریاستوں اور حکومتوں کی خوش انتظامی جانچنے کا بڑا زبردست معیار زمانہ بعد از جنگ کا اقتصادی عدم توازن تھا کہ حکومت ہند ایسی عظیم الشان سلطنت بھی بقول شخصے "جین" بول گئی اور ہر محکمہ میں تخفیف اور قطع و برید اس نے شروع کردی، لیکن دکن کے دم خم اس زمانہ میں بھی وہی رہے، جو کام جس طرح جاری تھے بدستور جاری رہے، جو ترقیاں ہونے والی تھیں، وہ برابر ہوتی رہیں، تنخواہوں میں جو سالانہ اضافہ ہوا کرتے تھے وہ اسی طرح ہوا کئے اور ایک لمحہ کے لئے بھی کسی نے یہ محسوس نہیں کیا کہ آگ کب لگی تھی اور کب بجھائی گئی۔ آپ اس زمانہ کے تمام حکومتوں کے بجٹوں کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ترازوں کے دونوں پلڑے برابر کرنے کے لئے کیسی کیسی ناگوار تدبیروں سے کام لیا گیا تھا لیکن ایک حیدر آباد ہی کا میزانیہ ایسا تھا جس میں کوئی ردو بدل نہیں کیا گیا اور کسی ایک شخص کو بھی شکایت کا موقعہ نہیں ملا۔ یہ سب حقیقتاً اعجاز تھا سر اکبر حیدری کی اس غیر معمولی تدبیر کا جس کا اعتراف اسوقت بڑے سے بڑے ماہر مالیات کو ہے اور جس نے ایسے نازک زمانہ میں بھی سلطنت دکن کی روایات ترقی کو کوئی صدمہ پہونچنے نہیں دیا۔ چنانچہ آپ کی انھیں غیر معمولی خدمات کا صلہ خسرو دکن کی طرف سے یہ ملا کہ سر مہاراجہ بہادر کے رٹائر ہونے کے بعد صدارت عظمیٰ کی خدمت آپ کے سپرد کی گئی، اور اس میں شک نہیں کہ اس سے بہتر انتخاب کوئی اور ہو نہیں سکتا تھا۔

انتخابات اور مسلمان

دستور جدید کے مطابق حال ہی میں جو انتخابات عمل میں آئے ہیں، وہ بحالاتِ موجودہ ہمارے دکھ درد کا

صحیح علاج ثابت ہوں یا نہ ہوں، لیکن یقینی ہے کہ اس نے ملک و اہل ملک کے لئے ایک سیاسی نجات کی شاہراہ ضرور متعین کر دی ہے اور ممکن ہے کہ اب مسلم جماعت بھی (جو اسوقت تک بدنصیبی سے سب سے زیادہ گم کردہ راہ تھی) اسپر چل پڑے ۔۔۔ ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں، سوائے پنجاب، بنگال، سرحد اور سندھ کے ہر جگہ کانگریس کے نامزد کردہ ممبر سب سے زیادہ کامیاب ہوئے ہیں اور جس آپا دھاپی کی حالت میں یہ سب کچھ ہوا ہے اس کو دیکھ کر ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ آیندہ شاید ہی کوئی غیر کانگریسی ممبر انتخاب میں آسکے۔

چنانچہ عام طور پر مسلمانوں نے اپنے باہمی اختلافات کے اس بُرے نتیجہ کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور کثرت سے شرکت کانگریس کا میلان ان کے دل میں پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ حد یہ ہے کہ سر وزیر حسن ایسا شخص بھی بے اختیارانہ پکار اُٹھتا ہے کہ اب اگر کوئی نجات کی صورت باقی ہے تو صرف یہ کہ مسلمان کانگریس میں بہ کثرت شریک ہوں چنانچہ جذبات کے اس تغیر کو دیکھ کر پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی محسوس کیا کہ ہندو مسلمانوں کے افتراق و اختلاف کے مٹنے کا زمانہ شاید اب دور نہیں اور ہو سکتا ہے کہ خدا مسلمانوں کی نجات کا کام بھی بجائے کسی مولوی کے ایک پنڈت ہی سے لینا چاہتا ہو۔

مسلم لیگ کا وجود یوں تو اس سے قبل بھی بیکار تھا اور اس نے جو کام اسوقت تک کیا اس کی صورت بالکل ایسی تھی جیسے پرانی دیوار پر قلعی کر دی جائے، لیکن اب اس انتخاب کے نتائج دیکھ کر ماننا پڑے گا کہ مسلم لیگ کا قیام نہ صرف یہ کہ غیر مفید بلکہ بڑی حد تک مضرت رساں بھی ہے اور اگر اب بھی مسلمان اس مردہ گھوڑے کو ایڑ دے دیکر اُٹھاتے رہے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ اب ان کی بے بصری واقعی علاج کے حدود سے گزر گئی ہے۔

مسٹر محمد علی جینا، اس میں کلام نہیں کہ نہایت قابل انسان ہیں لیکن قومی کام کے لئے جس ایثار و قربانی کی ضرورت ہے وہ ان میں مفقود ہے اور "شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی" کا فلسفہ نہ کبھی ان کی سمجھ میں آیا ہے نہ آسکتا ہے۔ جہانتک میں نے اندازہ کیا ہے محمد علی جینا کی ذہنیت وہی ہے جو ایک ڈکٹیٹر کی ہوا کرتی ہے اور اسی لئے وہ مسلم لیگ کے ڈھونگ کو قایم رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ انکا یہ ذوق وہیں پورا ہو سکتا ہے اور کانگریس سے علیحدہ رہنے کی بھی وجہ یہی ہے کیونکہ وہاں سوال شخص کا نہیں بلکہ صرف جانبازی کا ہے اور ظاہر ہے کہ انکا "ذوالجناح" اس فضا میں زیادہ پرواز نہیں کر سکتا۔ لیکن مسلمانوں کو اپنی اپنی جگہ سوچنا چاہئے کہ وہ کب تک اپنی قسمت کا فیصلہ دوسروں کے ہاتھ میں چھوڑے رکھیں گے اور شخصی تمناؤں پر اجتماعی مصالح کی قربانیاں کب تک چڑھائی جاتی رہیں گی۔ وقت اب نہ سوچنے کا ہے نہ پس و پیش کا۔ اسوقت تک صرف مرض کا علم تھا، تشخیص کا نہ تھا لیکن اب کہ یہ مسئلہ بھی طے ہو چکا ہے، اور علاج بھی معلوم ہو گیا ہے ہمارا بدستور خاموش بیٹھے رہنا یا "عطائیوں" کے ہاتھ میں اپنے آپ کو دیدینا یقیناً کھلم کھلا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ جمعیۃ العلماء دہلی پھر اس تحریک کو اپنے حلقہ میں زندہ رکھنا چاہتی ہے، خدا کرے یہ خبر صحیح ہو اور اسے مذہبی نقطہ نظر سے اس مسئلہ پر غور کرنے کی توفیق کبھی نہ میسر آئے۔

شعر اور عورت

(مسلسل)

زمانہ اسلام کے ابتدائی دور میں عربی شاعری کے اندر وہ زور باقی نہیں رہا جو زمانہ جاہلیت میں تھا، اس لئے کہ زمانۂ جاہلیت میں جو قبائلی عصبیت پائی جاتی تھی، اسے اسلام نے محو کر دیا تھا۔ قبائل کی باہم خانہ جنگیاں ختم ہو گئی تھیں اور سارے ملک میں "ھل من مبارز" کا نعرہ لگانے والا کوئی نہ رہا تھا، چنانچہ شاعری کی گرم بازاری بھی ختم ہو گئی اور اُن کی زبان آوری کا سیلاب شعر و سخن کے بجائے خطابت و موعظت کی طرف پلٹ گیا، اب اُن کی جادو بیانی اخلاقی اور معاشرتی تعلیم، قومی اور ملکی اصلاح، حمایت دین اور دعوت الی الحق میں صرف ہونے لگی، جس میں ظاہر ہے کہ عورت کا حصہ قدرتی طور پر کم ہوتا ہے۔ جذبات شاعری میں طوفان برپا کرنے والی دراصل تین چیزیں ہیں، جنگ، موت، محبت، زمانۂ جاہلیت میں گو عشقیہ شاعری تھی مگر بہت کم، اُن کی شاعری کا زیادہ حصہ مرثیہ گوئی اور فخریہ شاعری پر مشتمل تھا جو دراصل جنگ میں ناکامی اور کامیابی کے دو نتیجے ہیں۔

اُس زمانہ میں اہلِ عرب کی شاعری چونکہ اکثر قبائل میں خونریز جنگ کا باعث بن جایا کرتی تھی اس لئے آنحضرت کو اس سے دلچسپی نہ تھی، آپ سارے ملک عرب کو ایک پرچم کے نیچے جمع کرنا چاہتے تھے، جس میں اس قسم کی شاعری ہمیشہ سنگ راہ واقع ہوتی تھی، اس لئے آپ اس کو سیاسی حیثیت سے بھی کچھ زیادہ پسند نہیں فرماتے تھے، آپ فرمایا کرتے تھے کہ شاعر نے اگر کبھی کوئی سب سے اچھی اور سچی بات کہی ہے تو وہ صرف لبید کا یہ قول ہے:-

الا کل شیئٍ ماخلا اللہ باطل —— ہاں! خدا کے علاوہ سب کچھ جھوٹ ہے

(تاریخ آداب اللغۃ العربیہ جلد اول ص ۱۹۶)

مگر اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ آنحضرت صلعم شعر یا شعر گوئی کو بُری چیز سمجھتے تھے، آپ نے خود حضرت حسان بن ثابت، کعب بن مالک، عبداللہ بن رواحۃ کو کفار مکہ کا دندان شکن جواب دینے کے لئے مقرر کر رکھا تھا آپ مذکورۂ بالا حضرات کا کلام سنتے تھے، اظہار مسرت فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ اشعار کفار مکہ پر نیزے اور بھالوں سے زیادہ گہرا اثر کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ آپ نے حضرت حسان سے فرمایا:-

"اُھجہم (یعنی قریشاً) فو اللہ
لہجاؤک اَعلیہم اشد من
وقع السہام فی غلس الظلام
اُھجہم و معک جبریل روح القدس"

قریش کی ہجو کرو، خدا کی قسم
تمہاری ہجو اُن پر اُس تیر سے زیادہ کاری
ہوتی ہے جو اندھیری رات میں کسی پر پڑتا ہے۔
اُنکی ہجو کرو اسلئے روح القدس جبریل تمہارے مددگار ہیں۔

(کتاب العمدہ جلد اول صہ ۱۱۲)

خلفاء راشدین اگرچہ خود اچھے خاصے شاعر تھے چنانچہ حضرت ابوبکر کا وہ قصیدہ مشہور ہے جو انھوں نے غزوۂ علید بن حارث میں کہا تھا حضرت عمر اور حضرت عثمان کے بھی حکمت و موعظت پر بہت سے عمدہ اشعار منقول ہیں، حضرت علی تو شاعری اور خطابت کے امام ہی مانے جاتے ہیں، آپ کا دیوان بھی مصر و حجاز اور ہندوستان وغیرہ مختلف مقامات پر چھپ چکا ہے۔ تاہم شعر و شاعری کو مذکورۂ بالا وجوہ کی بناء پر یہ حضرات بھی کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے تھے، اس لئے اس دور میں فخریہ شاعری تو تقریباً مفقود ہو گئی، مرثیہ گوئی اور ہجو گوئی بھی برائے نام رہ گئی تھی، اخلاقی شاعری کو البتہ کسی قدر عروج ہوا، بہاریہ شاعری کا تو کہیں پتہ بھی نہ تھا، اور ملک کی آب و ہوا اور جائے وقوع کو دیکھتے ہوئے ہو بھی کیسے سکتا تھا،

ہاں عشقیہ شاعری جو انسان کے جذبات لطیفہ سے تعلق رکھتی ہے البتہ پائی جاتی تھی مگر بہت ہی معصومانہ انداز میں، نہ اُس میں وصل و ہجر کی بے بنیاد داستان ہوتی تھی اور نہ شہوانی خواہشات کے من گھڑت افسانے حتیٰ کہ کسی محبوبہ کا نام لیکر تشبیب کرنا بھی بدتمیزی میں داخل تھا، خلفاء راشدین اس معاملہ میں بہت سخت تھے، اگر کوئی شاعر ایسی حرکت کرتا تھا تو اُس کو درے لگوائے جاتے تھے۔

اسی مقدس عہد کے دو سچے عاشق و معشوق عتبہ بن حباب انصاری اور ریا بنت الفطریق اسلمی ہیں جو حسن و جمال کے ساتھ ہی ساتھ شعر و شاعری میں بھی کمال رکھتے تھے، ان دونوں کا افسانہ محبت کا وہ پاک صحیفہ ہے جس کا جواب دنیائے عشق میں تا قیامت نہ ہو سکیگا۔ داستان اگرچہ دلچسپ ہے لیکن طویل ہے اور ہمارے موضوع بحث سے خارج بھی اس لئے ہم اُسے نظر انداز کرتے ہیں۔ اس جگہ پر بجمال ریا بنت الفطریق کے صرف دو شعر نقل کئے جاتے ہیں جو اس نے اسوقت لکھے تھے جب وہ شادی کے بعد اپنے عاشق دولہا کے ساتھ مع سازو سامان کے اپنے گھر سے رخصت ہو کر مدینہ جا رہی تھی، راستہ میں غریب عتبہ ڈاکوؤں کے ہاتھ سے مارا گیا، جسے وہ کھڑی دیکھ رہی تھی۔

۱۔ تصبرتُ لا انّی صبرت و انّما
اُعلّلُ نفسی انّہا بک لاحقۃ

میں نے صبر کیا مگر یہ صبر اس لئے تھا کہ میں اپنی
جان کو تمہارے پاس پہونچنے کے لئے بہلا سکوں۔

۲ — ولو انصفت روحی لکانت الی الردی
اماماک من دون البریۃ سابقتہ

اگر انصاف کرو تو میری روح ہلاک ہو کر
تمام دنیا سے پہلے تمہارے پاس پہونچنا چاہئے

(الدر المنثور فی طبقات ربات الخذور صفحہ ۲۱۳)

نازنین ریّا نے یہ کہا اور ایک چیخ مار کر اپنے عاشق زار عقبہ کی لاش پر گری اور وہیں تڑپ کر جان دیدی۔ یہ قیامت کا منظر تھا جس پر ڈاکو اور قافلے والے سب ہی کھڑے رو رہے تھے، روتے روتے جب اُنھیں ذرا ہوش آیا، تو ان شہیدان باوفا کی لاشیں اُٹھا کر اُنھیں ایک ہی قبر میں دفن کر دیا، کچھ روز کے بعد ان کی قبر پہ ایک درخت اُگا جس کا نام لوگوں نے "شجرۃ العروسین" رکھا تھا، یہ تھا اُس خیر القرون کا پاک اور سچا عشق جس کی داستان قیامت تک حُسن وعشق کے بڑے بڑے افسانوں کو شرماتی رہے گی۔

خلفاء راشدین کا زمانہ ختم ہوتے ہی بنو اُمیہ کے عہد میں زمانہ جاہلیت کی شاعری پھر سے زندہ ہو گئی، قبایل میں پھر وہی عصبیت جاہلیہ اور خاندانی تفوق کا جذبہ پیدا ہو گیا، اور فخریہ شاعری نے دوبارہ جنم لیا، وجہ صرف یہ تھی کہ امیر معاویہ بڑے سیاسی اور مدبر آدمی تھے، انھوں نے جب اپنی حکومت کی بنیادیں مضبوط کرنا چاہیں تو اُن کو ضرورت محسوس ہوئی کہ قبایل عرب میں پھر وہی عصبیت جاہلیہ اور خاندانی تفوق کا جذبہ پیدا کر دیا جائے اور اہل بیت اور انصار علی کے خلاف خوب پروپیگنڈا کیا جائے تاکہ پھر کوئی سر نہ اُٹھا سکے، اس کام کے لئے انھوں نے بڑا روپیہ صرف کیا شعراء کو داد و دہش سے مالا مال کر دیا، اُن کی تنخواہیں اور وظیفے مقرر کئے جس سے شاعری کا پھر وہی دور آ گیا جو زمانہ جاہلیت میں تھا، مشاعرے کی مجلسیں منعقد ہونے لگیں، شعر وسخن پر تنقیدیں کیجانے لگیں جن میں مردوں کے دوش بدوش عورتوں نے بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔

خود سکینہ بنت حسین، عایشہ بنت طلحہ اور اُس زمانہ کے مشہور شاعر ابو دہبل کی بیوی عمرۃ وغیرہ اکثر شعر وسخن کی مجلسیں منعقد کیا کرتی تھیں۔ جن میں مرد بھی بلا تکلف شریک ہوا کرتے تھے، اُن کے کلام پر خوب خوب تنقیدیں کی جاتی تھیں، تبصرے ہوتے تھے، اور کلام کی خوبی پر دل کھول کر داد دی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت سکینہ کی دعوت پر اس زمانہ کے مشہور اساتذہ جریر، فرزدق، نصیب، کثیر اور جمیل جمع ہوئے سب نے باری باری سے اپنا اپنا کلام سنایا، آخر میں بثینہ کے عاشق زار جمیل کے پاس لونڈی آئی اور اُس نے کہا ہماری مالکہ آپ کو سلام کہتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ جب سے میں نے آپ کا یہ شعر سنا تھا میں آپ کا اور کلام بھی سننے کی مشتاق تھی،

۱ — الا لیت شعری ھل ابیتن لیلۃ
بوادی القری انی اذاً لسعید

کاش مجھے علم ہوتا کہ میں وادی القریٰ میں کبھی رات گزاروں گا تو میں اپنے کو اس وقت بڑا خوش نصیب سمجھتا۔

(الدر المنثور صفحہ ۲۲۶)

اس زمانہ میں گو بہت سی قادر الکلام عورتیں پیدا ہوئیں مگر ان میں جو مرتبہ لیلیٰ الاخیلیہ کا ہے کسی کا نہیں علامہ جرجی زیدان نے بھی لیلیٰ الاخیلیہ ہی کو سب پر ترجیح دی ہے اس لئے اس دور میں ہم صرف اسی کے مختصر حالات بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

لیلیٰ الاخیلیہ، عبداللہ بن مرحال کی بیٹی ہے، وہ اپنے زمانہ کی نہایت ہی پرجمال اور نازک خیال شاعرہ تھی۔ زمانہ اسلام کی نسوانی شاعری میں اس کا وہی مرتبہ ہے جو زمانہ جاہلیت میں خنساء کا تھا، اس زمانہ کا مشہور شاعر توبہ بن الحمیر العامری کو اس سے عشق تھا، پہلے تو چھپ چھپ کر وہ اس سے ملتا رہا، لیکن جب آتش عشق زیادہ تیز ہوئی تو اس نے لیلیٰ کے والد بزرگوار کے پاس شادی کا پیام بھیجا، چونکہ یہ خبر پہلے ہی اڑ چکی تھی کہ توبہ کو لیلیٰ سے عشق ہے اس لئے اس نے اس رشتہ سے انکار کر دیا اور قبیلہ بنی ادلع کے ایک شخص سے لیلیٰ کی شادی کر دی، توبہ کو اس کی پرواہ نہ تھی، ایک روز حسب معمول رات کی تاریکی میں لیلیٰ سے ملنے گیا، دیکھا تو خلاف معمول اس باعصمت خاتون کے چہرہ سے نقاب اٹھا ہوا ہے، توبہ کھٹکا اور سمجھا کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے، لیلیٰ آگے بڑھی اور اس نے رازدارانہ طریقہ سے کہا، میں دیر سے تمہاری منتظر تھی، لوگ تمہاری تاک میں ہیں، خیریت اسی میں ہے کہ ابھی یہاں سے چلدو، محبت کا مارا توبہ جان بچا کر بھاگا، مگر ساتھ ہی اس نے اس واقعہ کو ایک بڑے لمبے چوڑے قصیدہ میں نظم کر ڈالا جس کا ایک شعر یہ بھی ہے:-

کنت اذا ما زرت لیلی تبرقعت	میں جب کبھی لیلیٰ کے پاس آتا تھا تو وہ چہرہ پر نقاب ڈال لیا کرتی تھی
فقد رابنی منہا انعداۃ سفورہا	کل جو میں نے اسکی نقاب الٹی ہوئی دیکھی تو مجھے کھٹکا پیدا ہو گیا۔

لوگ عام طور سے چونکہ اس کے اور لیلیٰ کے پاک تعلقات پر طرح طرح کی نکتہ چینیاں کرتے تھے اس لئے وہ اسی قصیدہ میں اپنی اور لیلیٰ کی پاکدامنی کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:-

علیّ دماء البدن ان کان مجلہا	مجھے کفارہ میں اونٹوں کی قربانیاں دینی پڑیں اگر اسکا شوہر
یری لی ذنباً غیر انی ازورہا	علاوہ اسکے کہ میں اس سے مل لیتا ہوں مری اور کوئی خطا پا سکے

(الدر المنثور صفحہ ۴۶۹)

توبہ بڑا جنگجو اور دلیر نوجوان تھا، بہت سے غزوات میں اس نے شرکت کی اور ہمیشہ ظفر مندی کا پرچم اڑاتا ہوا لوٹا۔ ۸۵ھ میں ایک مرتبہ وہ بری طرح بنو عوف کے نرغہ میں پھنس گیا اور مارا گیا، لیلیٰ کو جب اس حادثہ غم کی اطلاع ہوئی تو اس کو دلی صدمہ پہونچا، اس غم میں اس نے بہت سے مرثیے کہے جن میں سے ایک درج ذیل ہے:-

۱- اقسمت ارثی بعد توبۃ ہالکا	میں نے قسم کھائی ہے کہ توبہ کے بعد سر ہلاک ہونے والے کا مرثیہ کہونگی اور ہر
احفل لمن دارت علیہ الدوائر	اس شخص کیلئے جلسہ تعزیت منعقد کرونگی جسپر مصائب ٹوٹ پڑے ہوں

۲- لعمرک ما بالموت عارٌ علی الفتی
اذا لم تصبہٗ فی الحیوۃ المعایرٗ

تمھاری جان کی قسم اُس نوجوان کے لئے باعث شرم نہیں ہے جس کی زندگی ننگ و عار سے خالی ہو۔

۳- وما احدٌ حیٌ وان عاش سالمًا
باخلد ممن غیّبتہ المقابرُ

کوئی زندہ شخص اگرچہ وہ بالفعل صحیح و سالم ہو ہمیشہ باقی رہنے والا نہیں، وہ اُن لوگوں میں سے ہو کر رہیگا جنکو قبروں نے غائب کر رکھا ہے۔

۴- ومن کان یحدث الدھر جازعًا
فلا بد یومًا ان یری وھو صابر

جس شخص کو زمانہ نے آج آہ و زاری میں مبتلا کر رکھا ہو کسی نہ کسی روز دیکھا جائے گا کہ اُسے صبر آگیا ہے۔

۵- وکل شباب او جدید الی بلیً
وکل امرئٍ یومًا الی اللہ صائرٗ

ہر جوانی اور نئی چیز بوسیدہ ہو کر رہے گی اور ہر شخص خدا کی طرف لوٹ کر رہے گا۔

۶- وکل قرینی الفتہ لتفرق
شتاتا وان ضنّا وطال التعاشر

دنیا کے تمام عاشق و معشوق جدا ہو کر رہیں گے اگرچہ وہ اس میں بخل کریں اور کتنے ہی دن تک زندہ رہیں

(الدر المنثور صـ۱۷۴)

لیلی اخیلیہ بڑی حاضر جواب اور زبان آور شاعرہ تھی، لیلی نے امیر معاویہ کا بھی زمانہ دیکھا تھا اور توبہ کے متعلق ان سے بہت دلچسپ باتیں بھی ہوئی تھیں۔ مروان اور عبد الملک بن مروان سے بھی ملی تھی اور اُن کو بھی دندان شکن جواب دے چکی تھی، اُسی زمانہ میں ایک مرتبہ والی عراق حجاج بن یوسف ثقفی نے اُس سے کہا "اب تو تمھاری جوانی گزر گئی سچ بتاؤ تم سے اور توبہ سے کیسے تعلقات تھے؟" لیلی نے کہا۔ "خدا کی قسم وہ ہمیشہ اپنے عشق میں پاکباز رہا، ہاں! ایک مرتبہ البتہ خواہشات نفس سے مجبور ہو کر اُس نے کچھ ناجائز ارادہ کیا تھا مگر میں نے یہ دو شعر پڑھے جس پر وہ نادم ہوگیا اور پھر کبھی اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔

۱- وذی حاجۃ قلنا لہ لا تبح لنا
فلیس الیھا ما حییت سبیل

ایک صاحب حاجت نے درخواست کی مگر ہم نے اُس سے کہا کہ یہ تمھارے لئے جائز نہیں، جب تک تم زندہ رہوگے کبھی اسیر کامیابی نہ پاؤگے

۲- لنا صاحبٌ لا ینبغی ان نخونہ
وانت لاخری فارغ وحلیل

میرا ایک شوہر ہے جسکی ہمیں خیانت نہ کرنی چاہئے اور تم بھی ایک دوسری عورت سے وابستہ ہو اور اُسکے شوہر ہو۔

حجاج نے پھر پوچھا "اچھا پھر کیا ہوا؟" لیلی نے جواب دیا کہ ایک مرتبہ اُس نے اپنے ایک دوست کو بھیجا اور کہا کہ ہمارے قبیلہ کے پاس کسی ٹیلہ پر چڑھ کر یہ شعر پڑھنا:۔

عفا اللہ عنہا ھل ابیتن لیلۃ
من الدھر لا یسری الیّ خیالھا

خدا اُس نازنین کے گناہ معاف کرے، کیا میں کبھی ایسی رات گزاروں گا جو میرے خیال میں بھی نہیں آتی۔

جب میں نے یہ شعر سنے تو فوراً میں سمجھ گئی کہ یہ توبہ کا فرستادہ ہے میں نے بھی یہ شعر کہکر فوراً اُسے سُنا دیا:۔

وعنہٗ عفاربی ذ احسن حفظہٗ عزیزٌ علینا حاجۃٌ لا ینالہا،	خدا اُسکے بھی گناہ معاف کرے اور اُس کو اپنی حفاظت میں رکھے اُسکی وہ حاجت جو کبھی بر نہ آئے گی ہمیں بہت عزیز ہے۔

(آداب اللغۃ العربیہ جلد اول صفحہ ۳۰۶)

لیلیٰ اخیلیہ کی موت کا واقعہ ایک عجیب داستان ہے، کہتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ اپنے بھائی قتیبہ بن مسلم سے ملنے خراسان گئی، واپسی میں توبہ کی قبر کے پاس سے گزری، شوہر بھی ساتھ تھا، لیلی نے شوہر سے اجازت چاہی، اُس نے منع کیا لیکن وہ نہ مانی، قبر پر پہونچی اور کہا "السلام علیک یا توبۃ"، جب کوئی جواب نہ ملا تو اُسنے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں اس سے پہلے کبھی توبہ کو جھوٹا نہیں سمجھتی تھی، کیا یہ توبہ کا قول نہیں ہے۔

۱۔ ولوان لیلی الاخیلیۃ سلمت علی ودونی تربۃٌ وصفائح	اگر لیلی اخیلیہ مجھے سلام کرے اور میری یہ حالت ہو کہ مجھ پر خاک کا ڈھیر ہو اور پتھر کی سلیں ہوں۔
۲۔ لسلمت تسلیم البشاشۃ اوانی الیہا صدیٰ من جانب القبر صائح	تب بھی میں اُسکو خوشی خوشی سلام کا جواب دونگا، یا پھر قبر کے پہلو سے ایک آواز بلند ہوگی جو اُسکے سلام کا جواب دیگی۔
۳۔ واغبط من لیلی بما لا انالہ، الا کل ما قرت بہ العین صالحُ	مجھے لیلی کی اُس چیز پر رشک ہے جسکو میں نہیں پا سکتا ہاں جو کچھ بھی آنکھوں کو ٹھنڈک پہونچائے وہ اچھی ہے،

(الدر المنثور صفحہ ۴۴)

یہ اشعار لیلی پڑھ رہی تھی کہ توبہ کی قبر سے ایک بہت بڑا اُلّو نکلا اور اُس کے اونٹ سے ٹکرایا، لیلی محمل سے گری اور وہیں جاں بحق ہو گئی۔

بنو اُمیہ کا عہد ختم ہوتے ہی عربی شاعری اور بھی معراج کمال پر پہونچ گئی، بنو عباس کا دار السلطنت بغداد تھا، وہاں کی آب و ہوا، باغات، نزہت گاہیں اور تمام وہ چیزیں جو شاعری میں کہربائی رنگ پیدا کر سکتی تھیں، قدرت نے ایک ایک کرکے اُس کو ودیعت کر دی تھیں، سارے ملک میں گل و سوسن ریحان و نسترن نرگس و نسرین، سرو و چنار کی بہتات تھی جس نے عربی شاعری کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔

شعراء عرب جب اپنی حدود چھوڑ کر بغداد کی سدا بہار زمین میں پہونچے تو اُن کے شاعرانہ جذبات بھی وہاں کی آب و ہوا کی اثر انگیزی کی وجہ سے بہت کچھ رنگین اور پرکیف ہو گئے اور وہ سادگی جو اُن کی شاعری کی روح تھی جاتی رہی، اُس کے بجائے لطافت و رنگینی، نزاکت و شوخی پیدا ہو گئی یہاں کے بہار آفریں اور نزہت خیز

مناظر نے ایسی روح پھونک دی کہ اُنھیں اپنی سادگی خود بری معلوم ہونے لگی۔ عرب کی شاعری میں ہم کو پہاڑوں کی بلندی، گھوڑوں اور اونٹوں کی رفتار، گرمی کی شدت، سفر کی مصیبت، مکانوں کی ویرانی اور بادِ سموم کے جھونکوں وغیرہ کا ذکر کثرت سے ملتا ہے، لیکن بغداد پہونچکر اس کا رنگ کچھ سے کچھ ہو گیا۔ یہاں کا سارا ملک مرغزار تھا، چپہ چپہ سرسبز و شاداب نظر آرہا تھا، ذرہ ذرہ آفتابِ حسن کی تنویر سے روشن ہو رہا تھا، پھر نوخیز ترکوں کے حسن کی معصومیت اس شراب کو دو آتشہ سے سہ آتشہ بنا رہی تھی، امراء و سلاطین کے دربار، دل میں ساقی گری اور مجلس آرائی کی خدمات انھیں شباب پروردوں کے سپرد تھیں۔ یہی جلوت و خلوت کے شریک سفر و حضر کے ہمدم تھے، اُن کے جمالِ جہاں آرا کی شوخیاں اور حسنِ نظر فروز کی رعنائیاں شباب پر تھیں، جس طرف اُنکی مدبھری نظریں اُٹھ جاتی تھیں اُس کو بیگانۂ عقل و ہوش ہونا پڑتا تھا۔

عہد بنو اُمیہ کے شعراء گو ان جذبات کی اثر انگیزی سے ناواقف تو نہ تھے، مگر یہ رنگینیاں اور سرمستیاں کہاں سے لاتے، جو بہاریہ اور عشقیہ شاعری کی جان ہیں۔ اُن کا حسن بدویانہ سادگی کا سرمایہ دار تھا، شوخی، شرارت، ناز و غمزہ سے ان کا حسن معرا تھا، اُن کے عشق و محبت کا مرکز امرد لڑکے نہیں بلکہ قانونِ فطرت کے موافق عورت کی ذات تھی اور وہ بھی پردہ نشین، اُن کے زمانہ میں بھی عشقیہ شاعری زوروں پر تھی، تشبیب بھی خوب خوب دل کھول کر کی جاتی تھی مگر ان سب میں بدویت کا رنگ غالب تھا۔ بنو امیہ کو اپنی عربیت اور بدویت پر ناز تھا وہ ملک عرب اور اُس کی تہذیب کے دلدادہ تھے اور اس کے مقابلہ میں تمام دنیا کو حقیر سمجھتے تھے مگر بنو عباس عربی تہذیب اور بدویت کو اپنی گردن کا ایک بدنما طوق سمجھتے تھے، اُن کی معاشرت سے متنفر اور اُس سے گلو خلاصی چاہتے تھے حتیٰ کہ خلیفہ منصور نے تو یہ طے کر لیا تھا کہ حجازی کعبہ توڑ کر ایک عراقی کعبہ قائم کیا جائے جہاں لوگ حج کیا کریں، مگر شکر ہے کہ وہ اپنی اس تجویز میں کامیاب نہ ہوا۔

بنو عباس کے دور میں عورتوں نے بھی مردوں کے دوش بدوش حصہ لیا چنانچہ تمام وہ چیزیں جو اس عہد کی خصوصیات سمجھی جاتی تھیں، عورتوں کے کلام میں بھی پائی جاتی تھیں۔ حتیٰ کہ امرد لڑکوں سے تشبیب کرنا جو اُس زمانہ کی سب سے بڑی خصوصیت تھی خواتین کی شاعری کا بھی جزو تھی۔ خود ہارون رشید کی بہن عُلیہ بڑی دقیقہ رس، سخن سنج، صاحبِ ذوق اور نامور شاعرہ تھی، شعر و شاعری کے ساتھ ہی ساتھ حسن و جمال، عفت و عصمت دینداری اور تقویٰ میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ مگر بایں ہمہ اُس زمانہ کے شاعرانہ دستور کے مطابق ہارون رشید کے دو غلام طل اور رشا، اُس کے معشوق تھے جن کو مخاطب کر کے وہ ہمیشہ طبع آزمائی کیا کرتی تھی۔ رشا کو مخاطب کر کے جو نظمیں اُس نے کہی ہیں اُس میں سے بعض میں رشا کے بجائے اُس میں زینب کا نام ڈال دیا ہے، مگر طل کو تو اُس نے ہر جگہ صاف نام لیکر مخاطب کیا ہے، طل سے اُس کو بہت زیادہ محبت تھی اُسکی شان میں

اُس نے بہت سے شعر کہے ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں:-

۱- یارب انی قد عرضت بہجرہ
فالیک اشکو ذاک یا ربّاہ

۲- مولاۃ سوء تستہین بعبدھا
نعم الغلام وبئست المولاۃ

۳- طلٌّ ولکنی حُرِمتُ نعیمہ
ووصالہ ان لم یغثنی اللہ

۴- یارب ان کانت حیاتی ہٰکذا
ضُرًّا علیّ فما ارید حیاۃ

خداوندا! میں اُس کے ہجر میں مبتلا کر دی گئی ہوں،
بار الٰہا! میں تجھی سے اس کی شکایت کرتی ہوں،
ایک نالائق مالکہ ہے جو اپنے غلام کے مقابلہ میں اپنے
کو حقیر سمجھتی ہے، وہ غلام اچھا ہے خود مالکہ نالائق ہے۔
وہ طل ہے، اگر خدا نے مجھ پر مہربانی نہ کی تو میں
اُس کی نعمت وصال سے محروم رہوں گی۔
خدایا! اگر میری زندگی اسی طرح میرے لئے
وبال جان رہی تو میں ایسے جینے سے باز آئی

(کتاب الاغانی جلد نہم صـ۹۳)

ہارون رشید کو اس کی اطلاع ہوگئی تو اُس نے عُلیّہ کو بلا کر قسم لی کہ آیندہ وہ کبھی اس کا نام زبان پر نہ لاوے گی، علیہ نے وعدہ کرلیا اور وہ چلی گئی، ایک مرتبہ وہ اپنے کمرہ میں بیٹھی تلاوت قرآن میں مشغول تھی جب وہ اس آیت پر پہونچی "فان لم یصبہا وابلٌ فطلّ" تو بے اختیار اُس کی زبان سے نکل گیا:- "فالذی منعنا امیر المومنین"۔

خوش قسمتی سے ہارون رشید اُس وقت کہیں کھڑا سن رہا تھا، اس پر اس جملہ کا بڑا اثر ہوا، سیدھا اُس کے کمرہ میں چلا گیا اور اُس کی پیشانی پر بوسہ دیکر بولا "میں نے طل تمہیں کو دے ڈالا اب تم جو چاہو کرو"۔
ہارون رشید کو علیہ سے بڑی محبت تھی، اُس کو سفر و حضر میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اور اُسکے آرام و آسائش کا بڑا خیال رکھتا تھا، ایک مرتبہ وہ ملک رے گیا تو علیہ بھی ساتھ تھی جب وہ مقام مرج پہونچی تو اُس نے یہ شعر کہے:-

۱- ومغترب بالمرج یبکی لشجوہ
وقد غاب عنہ المسعدون علی الحب

۲- اذا ما اتاہ الرکب من نحو ارضہ
تنشق یستشفی برائحۃ الرکب

مرج کے قریب پہونچنے والا غم والم کے آنسو بہا رہا ہے۔
اور محبت میں کامیاب ہونے والے نظروں سے اوجھل ہیں
جب کوئی سوار وطن کی طرف سے آجاتا ہے تو وہ
اُس کے پاس جاکر سونگھتا ہے کہ شاید بوئے وطن آئے۔

(الدر المنثور صـ۳۵)

ہارون رشید نے جب یہ شعر سنے تو سمجھ گیا کہ وطن کی یاد علیہ کو ستا رہی ہے، اُس نے فوراً اُسے واپس

پہونچانے کا حکم دیا، اسی طرح ایک مرتبہ کسی ضرورت سے شہر رقہ گیا، عجلت میں علیہ ساتھ نہ جا سکی، وہاں پہونچکر اس نے علیہ کو بلوا بھیجا، جب وہ محمل میں بیٹھکر روانہ ہوئی تو اُس نے یہ شعر کہا:۔

لولا الرجاء لمن املت رؤیتہ ماجزت بغداد فی خوف وتعذیر	اگر اُس شخص سے امیدیں وابستہ نہ ہوتیں جسکے دیدار کی متمنی ہوں تو میں بغداد سے اس خوف وخطر کی حالت میں روانہ ہوتی

علیہ شاعری کے علاوہ علم موسیقی میں بھی بڑا کمال رکھتی تھی اور اپنے ہی شعروں میں اپنی ذہانت اور طباعی سے ایسی دھنیں قائم کرتی تھی کہ جو سنتا تھا اپنا سر دھننے لگتا تھا۔ لیکن باوجود ان تمام مشاغل کے وہ بڑی دیندار، پرہیزگار اور پابند صوم وصلوۃ تھی، شاعری میں باوجودیکہ عاشقانہ مضامین نظم کرتی تھی اور کھلے ہوئے صاف صاف لفظوں میں تشبیب کرکے زورِ طبع دکھایا کرتی تھی، مگر کسی شخص کو کبھی اُس کی پاکدامنی میں شک وشبہ نہیں ہوا وہ خود کہا کرتی تھی کہ یہ سب کچھ محض تفنن طبع کے لئے ہے۔

ایک دفعہ ہارون رشید ایک کنیز کے دام محبت میں پھنسکر عیش وطرب کے مزے اُڑا رہا تھا اور دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو گیا تھا، علیہ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اُس نے فوراً دو شعر کہے اور اپنی کنیزوں کو اُس کا سُر بتا کر گوایا جسے سنکر ہارون رشید مبہوت ہو گیا، اور اپنی بیجا حرکت پر انتہا سے زیادہ نادم ہوا، وہ شعر یہ ہیں

۱۔ منفصل عنی وما قلبی عنہ منفصل	اُس نے مجھے چھوڑ دیا مگر میرا دل اُس سے جدا نہیں ہوتا
۲۔ یا قاطعی الیوم لمن نویت بعدی ان تصل	اے آج مجھے چھوڑنے والے بتا تو سہی کہ اب تو نے مرے بعد کس سے ملنے کا ارادہ کیا ہے۔

(کتاب الاغانی جلد نہم ص۸۸)

افسوس ہے کہ دولت عباسیہ کا آفتاب ڈھلتے ہی تمام علوم وفنون کے ساتھ شاعری کا بھی خاتمہ ہو گیا، ۶۱۶ھ میں چنگیز خاں نے تاتار سے نکل کر خراسان سے شام تک تمام ملک برباد کر دیئے، سینکڑوں شہر خاک میں مل گئے، زمین وآسمان میں سناٹا چھا گیا، مدینۃ العلم بغداد کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور کم وبیش چالیس پچاس لاکھ آدمیوں کا خون بہہ گیا، مغلوں کی اس تباہ کاری نے لوگوں کے دلوں کو بجھا دیا اور طبیعتوں کو مضمحل کر دیا جس کا اثر تمام علوم وفنون کے ساتھ شعر وشاعری پر بھی بہت برا پڑا۔ شعر وسخن سے دلچسپی رکھنے والے خانہ نشین ہو گئے، اور اپنا وقت دوسرے مشاغل میں صرف کرنے لگے، اور عربی شاعری کا وہ رنگ جو دولت عباسیہ میں تھا ہمیشہ کے لئے فنا ہو گیا۔

عہد مغلیہ کے سلاطین وامراء کو اس سے قطعی دلچسپی نہ تھی، اُن کے درباروں میں کسی عالم یا فاضل کو

تقرب ہوتا تھا تو محض اس لئے کہ وہ اس عہد کی تاریخ مرتب کریں، جنگی کارنامے لکھیں یا پھر علمی، ادبی، سیاسی اور مذہبی کتابیں تصنیف کریں اور بس۔ اس عہد میں چونکہ علوم بغداد، بخارا، رتے، قرطبہ اور اشبیلیہ وغیرہ سے منتقل ہو کر قاہرہ، اسکندریہ، دمشق، حمص اور تونس وغیرہ میں آ گئے تھے اس لئے یہاں کے باشندوں میں خال خال شعر و سخن کا چرچا باقی تھا۔ مگر عربی شاعری کا وہ عہد شباب جو دولت عباسیہ میں تھا ایسا فنا ہوا کہ آج تک نہ لوٹا اس لئے ہم اسی دور کے حالات پر اپنے مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

زمانۂ اسلام میں عہد عباسیہ تک کی مشہور شاعرہ خواتین میں عاتکہ بنت عمرو بن نفیل، خولہ بنت الازور الکندی، ام حکیم بنت قارظ، ہند بنت زید بن مخرمۃ الانصاریہ، عریب بنت جعفر البرمکی، لیلیٰ بنت طریف، حمدہ بنت زیاد، لطیفۃ الحدانیہ، حفصہ بنت حجاج الرکونیہ، حمدونیہ بنت عیسیٰ، عائشہ بنت احمد، نزھون الغرناطیہ الشاعرۃ الغسانیۃ الشبیلیۃ الاندلسیہ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن کی شاعرانہ نازک خیالی اور ادیبانہ بذلہ سنجی سے ملک و قوم ہی نہیں بلکہ اس زمانہ کے سلاطین بھی لطف اندوز ہوتے تھے اور اُن کی شاعری اور زبان آوری کی ساری دنیا میں دھوم تھی۔

شواعر عرب کے حالات اور اُن کے اشعار تاریخ و سیر کی کتابوں کے علاوہ کتاب الاغانی، کتاب الشعر والشعراء، طبقات الشعراء، محاضرات الادباء، کتاب المنظوم والمنثور، کتاب الصناعتین، کتاب العمدہ المثل السائر فی ادب الکاتب والشاعر وغیرہ ادب کی کتابوں میں بھی جستہ جستہ ملتے ہیں مگر زمانۂ حال کی مصری ادیبہ سیدہ زینب بنت علی العاملی کی کتاب "الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور" صنف نسواں کے علمی و ادبی خدمات پر بہترین تصنیف ہے، اس میں خواتین عرب کے حالات بہت کچھ تفصیل سے ملتے ہیں جس میں وہ بھی شامل ہیں جنکو شعر و شاعری سے دلچسپی تھی، لیکن افسوس ہے کہ ان جواہر پاروں کا ذخیرہ اسقدر بکھرا ہوا ہے کہ ان کو یکجا کر کے ایک سلک میں پرونا ہفتوں نہیں مہینوں کی فرصت کا محتاج ہے، انشاء اللہ آیندہ کسی فرصت میں اس موضوع پر کچھ زیادہ تفصیل سے بحث کرنے کی کوشش کروں گا۔

سید جلیل الرحمان اعظمی

اگر آپ روحانیات سے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو "جن" کے پرچے مطالعہ کیجئے

فی پرچہ اصل قیمت ۲ /۔ رعایتی ا/ علاوہ محصول۔ مینجر نگار لکھنؤ

ہماری بُت پرستیاں

سرفراز (لکھنؤ) مورخہ ۸ رجمادی الاول ۱۳۵۵ھ میں سید اکبر حسین صاحب رضوی (کوئٹہ) کا مضمون "شیعہ اور گریہ و بکا" جب میں نے پڑھا تو مجھے اس لئے حیرت ہوئی کہ رضوی صاحب کے اکثر خیالات میرے اُن خیالات سے ملتے جلتے ہیں جن کی ابتدائی کشاکش بچپن کے معصومانہ زمانہ میں پیدا ہوئی تھی اور اب تو میں اسے محسوس کر کر کے اس بے راہ روی پر افسوس ہی نہیں ماتم کرتا ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ رضوی صاحب کے قلم کا لہجہ ذرا "سرحدانہ" ہوگیا ہے مگر میری رائے میں یہ درشتی اُن اوہام کا ردعمل ہے جو مذہب کے پردے میں ہمارے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں، جنھوں نے ہم کو حقیقت سے دور کر دیا ہے اور ہماری روحِ صداقت کو چھپا کر رکھدیا ہے۔

میں نے شیعہ خاندان میں آنکھ کھولی، شیعی فضا میں تربیت پائی اور شیعی رسم و رواج ہی سے واسطہ پڑا، اسلئے میں اُن مراسم سے اچھی طرح واقف ہوں جنھوں نے "شیعیانِ علی" کے پاک نہاد مشرب میں داخل ہو کر نہ معلوم اُسے کیا سے کیا بنا دیا اور ایک شیعوں پر کیا منحصر ہے میں تو سارے اسلامی افق کو اوہام باطلہ کے بادلوں سے گھرا ہوا پا رہا ہوں، اور جب کبھی مجھے کوئی سنجیدہ موقع مل سکا ہے میں نے اپنے حلقۂ احباب میں (خواہ وہ شیعہ ہوں یا سُنی) اس حقیقت کے اظہار میں کبھی پس و پیش نہیں کیا:-

حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است و بس
در بند ایں مباش کہ نشنید یا شنید

رضوی صاحب نے اپنے مضمون میں عزاداری کی بدعات اور موقع بے موقع مجالس کے انعقاد پر نکتہ چینی کی ہے جس سے میں اس حد تک متفق ہوں کہ شہادتِ عظمیٰ کا مقصد صرف گریہ و بکا ہی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ کربلا کی حسینی تعلیمات پر غور کرنے اور انھیں اپنا نصب العین بنانے کی ضرورت ہے، کیونکہ دنیا کی تاریخ میں "ذبح عظیم" کو شرما دینے والا یہ وہ غیر فانی واقعہ ہے جس کی مثال کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی، دنیا نے ازل سے اب تک بیشمار کروٹیں بدلی، ان گنت اقوام و ملل منصۂ شہود پر آتی اور فنا ہوتی رہی ہیں اور شاید ہی کوئی قوم ایسی ہو جس کی تاریخ کا کوئی ورق کسی خونیں داستان سے رنگا ہوا نہ ہو لیکن یہ تمام خونفشانیاں، یہ تمام

صف آرائیاں اور یہ تمام تیغ آزمائیاں حیاتِ عمرانی کی کشمکش کا نتیجہ تھیں جس کا مقصد یہ تھا کہ ایک کو دوسرے پر تفوق حاصل ہو جائے اور ملکی و سیاسی خواہشات کی قربانگاہ پر انسانی جانوں کی بھینٹ چڑھ جائے۔ ان محاربات کو حق و باطل سے کوئی واسطہ نہ تھا بلکہ اُن حسیات کو سکون پہونچانا تھا جو کسی قوم کی فاتحانہ حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے انسانی دل و دماغ میں پرورش پاتی رہتی ہیں۔

جنھوں نے تاریخ کی ورق گردانی کی ہے اور اُس کے صحیح نتائج کو اخذ کر سکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یورپ و ایشیا کے بڑے بڑے صاحبانِ فکر نے کربلا کے اس "ذبح عظیم" کو دنیا کا عظیم الشان واقعہ مانا ہے، اور چند تنگ نظروں کو چھوڑ کر سب متفق اللفظ ہیں کہ یہ جانگداز اور روح فرسا واقعہ اپنی نوع کا ایک ہی واقعہ تھا، جو سیاسیات، ذاتیات اور نزاع مالی و ملکی سے بالکل دور صرف حق و صداقت کی حمایت میں پیش آیا، حقیقت یہ ہے کہ امام مظلوم نے اپنی قربانی سے نہ صرف اسلام کی صداقت پر مہر دوام ثبت فرمادی بلکہ ساری دنیا کو دکھا دیا کہ دیکھو معرفتِ ربانی اس کا نام ہے، شیوۂ تسلیم و رضا اس کو کہتے ہیں اور صداقت و حقانیت کی آزمائش میں ثابت قدمی کا یہ مفہوم ہے۔

مذہبی کتب میں (متفقہ فریقین) یہ موجود ہے کہ کربلا کے شہید اعظم کے اس انعام کی اطلاع نانا کی پیغمبری کو دیدی گئی تھی، ماں کی مامتا بتا گئی تھی اور باپ کی شفقت سمجھا گئی تھی اس لئے وہ جان بوجھکر چلے، سوچ سمجھ کر روانہ ہوئے اور صرف اُن کو ہمراہ رکاب رکھا جنھیں قدرت نے اس سعادت کبریٰ کے لئے ازل ہی میں نامزد کر دیا تھا، جن کے پیشِ نظر صرف یہ مقصد تھا کہ اسلام کا قصرِ نو تعمیر کہیں پھر عہدِ جاہلیت کی باطل پرستیوں سے نہ ہل جائے اس لئے مشیت ایزدی نے چاہا کہ باطل پرستوں کو دکھا دیا جائے کہ توحید کس کو کہتے ہیں، رسالت کا مقصد کیا ہے اور امامت کے فرائض کیونکر ادا ہوتے ہیں، یہ نہ سمجھئے کہ کربلا کے حسینؑ نے خونریزی سے اجتناب کے لئے اتمام حجت نہیں کی لیکن بندگانِ ہوس کی باطل پرستیاں بھڑکا رہی تھیں، ناپاک خواہشیں بہکا رہی تھیں اور خود پسندیاں اُکسا رہی تھیں، جب وعظ و پند بے اثر رہے اور تعلیم و تلقین بیکار ہوگئی تو کچھ دیر ذوالفقار حیدری کے جوہر بھی دکھا دئے اور صبر و ضبط کا عملی درس بھی دیدیا اور پھر یہ فرماتے ہوئے رضائے دوست پر سر جھکا دیا:۔

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

یہ تھی شہادت اور یہ تھا مقصدِ شہادت، اب آئیے عزاداری کے متعلق غور کریں کہ یہ کیونکر وجود میں آئی اور شہادت سے اس کا کیا تعلق ہے، باطل پرستوں نے جب تلواریں نیام کرلیں اور اس عارضی فتح کا نشہ ایک ابدی شکست کا عنوان بن کر اُتر گیا تو وہ لٹا ہوا قافلہ روانہ ہوا جس کی بیکسی پر ایمان والوں کی

آنکھیں خون کے آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکیں، کوئی اپنے مولا کے لئے رویا، کسی نے اپ وجد کی یاد میں آنسو بہائے اور کوئی اُس پیکرِ حق و صداقت کے عزم و استقلال سے متاثر ہوا۔ غرض مختلف قسم کے تاثرات تھے جو دل میں تڑپ پیدا کرتے تھے اور آنکھوں سے ظاہر ہونے لگتے تھے، یہ وہی جذبۂ بے اختیارانہ ہے جو اس غم کو دل سے دور نہیں ہونے دیتا اور نہ آنکھیں خشک ہوتی ہیں، اسی نے شعراء سے مرثیہ لکھوائے اسی نے بین اور نوحوں کے اسلوب وضع کئے، اور اسی نے خاموش آنسو بہانے کے انداز سکھائے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبایل میں سنسنی پھیل گئی، اہل عرب و عجم میں بے چینی پیدا ہوگئی اور دنیا جانتی ہے کہ قدرت دشمنانِ ملت سے انتقام لئے بغیر نہ رہی، آج نہ یزید ہے اور نہ اُس کی باطل پرست ذریات، نہ شمر ہے اور نہ ابن زیاد، ان کا نام تاریخ کے اوراق میں اس لئے محفوظ ہے کہ ان کی بے دینی کے کارنامے عبرت و بصیرت حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ دہرائے جائیں۔

رونا رُلانا ایک فطری چیز ہے انسان جب غیروں کے دکھ درد سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تو ایسے ایمان پیکر آقا کی بیکسی اور مظلومیت پر کیونکر خاموش رہ سکتا ہے، مجلسِ عزا کا بانی علم النفس کے اس راز سے واقف تھا کہ اگر کربلا کے واقعات کو بار بار دہرایا جائے گا تو حسین مظلوم کی تعلیم ہمیشہ حافظوں میں باقی رہے گی اور اُن کے خدائی کارنامے حیات ابدی پا سکیں گے۔ بظاہر تو رونا ہے مگر یہی آنسو ایمان کو تازہ رکھتے ہیں، لیکن رفتہ رفتہ دنیا جس قدر حق و صداقت سے دور ہوتی گئی اسی قدر اصل مقصد سے بُعد ہوتا چلا گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ آج شہادت کی روح صرف گریہ و بُکا ہی سمجھی جاتی ہے اور اُس کی بے اندازہ برکتیں طاق نسیاں کی نذر ہو کر رہ گئی ہیں، حالانکہ یہ تو ایک ایسا واقعہ ہے جس نے نبوت کی تکمیل کی، جس نے توحید کی بنیادوں کو استوار کیا، اور ہمیں جہل و باطل اور فسق و فجور کی تاریکیوں سے نکالا تاکہ ہم اپنے کو عرفانِ حق اور احساس صداقت کا اہل ثابت کریں اور خدا کی راہ میں اس والہانہ سرفروشی کا ثبوت دیں۔

حسین کا پیغام ہے کہ باطل کے آگے پیشانیاں نہ جھکاؤ، ہجوم باطل کا مردانہ وار مقابلہ کرو، صداقت کے لئے جان و مال قربان کردو، ایمان و حق پر ثابت قدم رہو، اور وہ سب کچھ کرو جس سے خدا کی خدائی باقی رہے اور انسانیت ذلیل نہ ہو، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہم نے عملی طور پر اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کی ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے اور جب ہمارا ایمان اس درجہ خفیف و کمزور اور ہمارے عادات و اخلاق اس قدر انسانیت سوز ہیں تو للہ مجھے بتایئے کہ واقعۂ شہادت سے جیسے "ذبح عظیم" پر آپ کو رونے اور اسے اپنے سے متعلق کرنے کا کیا حق ہے؟ آپ میں جب ایسے ایمان و ایقان اور حق و صداقت کی شان باقی نہیں ہے تو حسینؑ کے ایسے مولائے کائنات سے اپنی وابستگی کیونکر قائم رکھ سکتے ہیں اور دُنیا اسے تسلیم کرنے کی غلطی میں کیونکر

مبتلا ہو سکتی ہے، ہمارے سارے دین و ایمان کا خلاصہ صرف اس قدر رہ گیا ہے کہ محرم کے عشرہ میں سوگواروں کی صورت بنا کر، مجلسوں میں رسمی طور سے شریک ہو لیں، اور سوز خوانوں کی آواز کے اُتار چڑھاؤ پر واہ واہ کر لیں، "تحت اللفظ" خوانوں کی بہاریہ تشبیبوں پر جھوم لیں، ساقی نامہ میں عرفانی شراب کے جلوے دیکھ لیں، کبھی گھوڑوں کی سُبک رفتاریوں پر حیران ہو جائیں، کبھی تلوار کی خون آشامیوں سے کانپ اُٹھیں اور پھر داد و ستائش کے فلک شگاف نعروں سے چھتوں کو ہلا دیں، ٹوپیاں اُچھلتی دیکھیں، اور تعریف کرنے والوں کی تہذیب کا ماتم کریں، یہ مجلس تو نہ ہوئی، ایک مشاعرہ کی محفل ہو گئی۔

کیا آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ ایسی مشاعرہ نما مجلسوں میں، صداقت کی روح کس کس طرح کانپ جاتی ہوگی، آپ کے اس شیوۂ مذہبی سے اصل مذہب کو کیا شکایت ہوتی ہوگی اور آپ جس کے اسوۂ حسنہ کے پیرو ہیں اُس کی روحِ مقدس آپ کے اس اندازِ عمل پر کس قدر بے چین ہوتی ہوگی۔ یقین کیجئے کہ حسینؑ خدا کے اُس برگزیدہ ترین بندہ کا اسم گرامی ہے جس نے خدا کی راہ میں سب کچھ قربان کر دیا، پھر کیا اُن کا مطالبہ آپ سے چند ظاہری رسوم کی حد تک ہے، جنھوں نے ساری کائنات کو حق و صداقت کا درس دیا تھا، جنھوں نے سارے اوہام باطلہ کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا تھا، اُن کا تو ہر عمل ایک مستقل درس ہے اُن کے لئے جو قلت سے گھبرا کر باطل کے سامنے سر جھکا دینے پر مجبور ہوتے ہیں، جو ناحق کا ساتھ دے کر اپنی ضعفِ ایمانی کا ثبوت دیتے ہیں، حسینؑ آپ سے صرف رو لینے کے طالب نہیں ہیں، بلکہ آپ سے دینِ متین کی استواری کے طالب ہیں، آپ سے صداقت کی تعمیر میں سرفروشی کے طالب ہیں اور اُن تمام حق پرستیوں اور حق شعاریوں کے طالب ہیں جو جہل و باطل کی تاریکیوں کو افقِ ہستی سے مٹا کر دنیا کو سراپا انوار کر دیں۔

میں نہیں کہتا کہ مجلسوں سے وہ مقصد بالکلیہ پورا ہی نہیں ہوتا جس کے لئے ان کو وضع کیا گیا تھا لیکن ضرورت یہ ہے کہ اس یادگار شہادت کو اُس مرکز پر آنا چاہئے جو اسوۂ حسینی کی تبلیغ کا کام دے سکے۔ اس کو اسی حدود میں رکھنا چاہئے جس سے اصل مذہب متاثر نہ ہو اور تعلیماتِ حسینی کی روح کو صدمہ نہ پہونچے، صرف رونے رُلانے کو ذریعہ نجات نہ خیال کیا جائے بلکہ اس کے ساتھ اپنے باطن کی اصلاح اور اُن حقایق کی تکمیل ہونی چاہئے جو اس شہادت کبریٰ کے پردے میں سکھائے گئے ہیں اور جو ساری کائنات میں دینِ حنیف کا طغرائے امتیاز ہیں، ہم میں ایک یہ عیب بھی استحکام کے ساتھ پیدا ہو گیا ہے کہ جس بات کو ہم اچھا سمجھتے ہیں، اُسے اپنے ضمیر کی آواز بھی جانتے ہیں، میں اپنے ایمانی بھائیوں سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا تعزیہ و علم اور قبر پرستی کی حدیں بت پرستی سے نہیں مل جاتیں، آپ ایک خدا کے ماننے والے ہیں، وہ خدا جو دانا بھی ہے اور بینا بھی، قادر بھی ہے اور توانا بھی، زندہ بھی ہے اور گویا بھی، اسلئے

کسی دوسرے کے سامنے نہ آپ کی پیشانی جھک سکتی ہے نہ آپ کے دل میں وہ گداز پیدا ہو سکتا ہے جو معبودِ برحق کی عبادت کے لئے مخصوص ہے، پھر اے صاحبانِ توحید! اے آفریدگارِ واحد کے پرستار یہ لکڑی اور کپڑے کے اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے کھلونوں اور مٹی کے ڈھیروں کے سامنے نیایش اور فروتنی کیسی! میرے ایمان کے نزدیک تو اسلامی ضمیر کو اس پر شرم آنی چاہئے وہ ضمیر جو سوائے معبودِ حقیقی کی توحید کے اور کچھ نہیں جانتا، وہ ضمیر جو خدائے واحد کی پرستاری کو زندگی سمجھتا ہے، وہ ضمیر جو صرف اسی ایک صداقت کی حمایت کا دعویدار ہے، میں یہ جانتا ہوں کہ اس گئی گزری حالت میں بھی کوئی مسلمان انھیں خدا نہیں سمجھتا مگر اُن کے توسل سے اپنی عقدہ کشائی کا آرزومند ضرور ہوتا ہے اس لئے نفس کا فریب جہالت کا ڈھکوسلا ان سے وہ تمام خدا کی صفات منسوب کرنے میں تامل نہیں کرتا جو صرف خدائے تعالیٰ کی صفات خاصہ ہیں، اولاد ان سے مانگی جاتی ہے، شوہر کے التفات ان سے طلب کئے جاتے ہیں، بچوں کی زندگی، بیماروں کی صحت اور مالی پریشانیوں سے نجات، غرض کونسی ایسی تمنا نہیں ہے جن کا ان سے مطالبہ نہیں کیا جاتا، اس میں شک نہیں کہ ایمان ہم کو رسول اور آلِ رسول ہی سے ملا ہے، خدا کو ہم نے انھیں کی وجہ سے پہچانا ہے، توحید کے اسرار انھیں نے ہمیں بتائے ہیں۔ لیکن یہ تو سوچئے کہ انھوں نے ہماری زندگی کی اصلاح کے لئے کیا طریقے اختیار کئے اور ہمارے ذہن و دماغ سے اوہام کیونکر مٹائے، اُنھوں نے سارے معبودانِ باطل سے چھڑا کر ایک خدا سے ہمارا رشتہ جوڑا اور اپنی خدائی زبان سے فرمایا:-

انا بشر مثلکم

اس کا مطلب بالکل صاف ہے کہ کہیں وہ صفات ہماری ذات سے منسوب نہ کر دینا جو صرف خداوندِ حقیقی کے لئے ہیں، لیکن ہم باوجود اس دعوئے توحید و حق پرستی کے وہ سب کچھ کر رہے ہیں جو حریفِ اسلام ہے، دشمنِ توحید ہے اور اُن کی تمام تعلیمات کے بالکل مخالف ہے اور اس پر یہ بوالعجبی کہ یہ یقین بھی کرتے ہیں کہ اُن کی ارواحِ مقدسہ ہمارے ان اعمال سے خوش ہوتی ہوں گی میں جب یہ سوچتا ہوں تو میرے تاب کی رگیں ہل جاتی ہیں کہ ہم ان سیاہ کاریوں کو اپنے دامن میں لیکر اُنھیں کیا منہ دکھائیں گے جنھیں زبان سے تو ہمیشہ اپنا آقا اور مولا کہا اور دل سے کبھی نہ جانا کہ اُن کی تعلیمات اور اُن کا اسوۂ حسنہ کن اجزا سے عبارت تھا، حیف!

بُت گری پیشہ کیا بت شکنی کو چھوڑا!

تعزیہ داری کی ابتدا کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی بنا امیر تیمور کی عقیدت نے ڈالی تھی جس کو شاہ نجف اور سلطانِ کربلا سے والہانہ عشق تھا، لیکن اُس کے بڑھتے ہوئے فاتحانہ عزائم اُسے

ایک مقام پر زیادہ ٹھہرنے کا موقع نہ دیتے تھے جس کی وجہ سے وہ بقدرِ شوق حاضری کی سعادت حاصل نہ کرسکتا تھا، اُس نے روضۂ مبارک کی نقل (ضریح) اس لئے بنوائی تھی کہ وہ اس سے اپنے ایمانی جذبات کی تسکین کرسکے، اس روایت کی صحت میں اکثر حضرات کو کلام ہے ممکن ہے کہ صحیح ہو میں اس پر کوئی ایسی گفتگو کرنا نہیں چاہتا جس سے مورخانہ چھان بین شروع ہوجائے، کیونکہ عقاید نے دنیا میں بڑے بڑے انقلاب پیدا کئے ہیں اس لئے اگر تیمور نے اپنے جذبۂ شیفتگی کے اظہار میں روضۂ مبارک کی نقل بنوالی تو اس پر حیرت واستعجاب اور حجت وتکرار کیوں کی جائے، جب کہ اہل بیت کے ساتھ مسلمانوں نے علی العموم جذبات شیفتگی وارادت کے اظہار میں مختلف پیرائے اختیار کئے ہیں انھیں میں سے ایک یہ بھی ہوسکتا ہے، لیکن مسلمانانِ ہند یہاں کی اوہام پرست فضا میں اس پر کیوں اکتفا کرتے، انھوں نے تعزیہ داری کی عقیدتمندانہ رسم کے سایہ میں دُنیا کی ساری بدعتوں کو جمع کردیا اور وہ رنگ کھیلے جن پر رسالتمآب کا اسلام یقیناً ماتم کرتا ہوگا، ذرا سوچئے تو کہ جماعت حسینی اور مہندی وضریح کی رسمیں اور پھر اُن کے نام سے جو ان رسم ورواج کو مٹانے آئے تھے جو ان اوہام باطلہ کو دماغوں سے نکالنے آئے تھے، جب معمولی ٹٹوؤں کو دُلدل اور ذوالجناح کا مرتبہ دیکر سڑکوں پر پھرایا جاتا ہوگا جب امام زین العابدینؑ کے جیسے عابد وزاہد صاحب عرفان حقیقت کے لباس میں کم سواد انسانوں کو اونٹ پر دکھایا جاتا ہوگا تو خدارا غور کیجئے کہ ملت حقہ کے دل پر کیا گزرتی ہوگی اور شہدائے کربلا کی ارواح مقدسہ کی کیا حالت ہوتی ہوگی ان حالات میں اگر اغیار ہم پر آوازے کستے ہیں اور ان مراسم کو رام لیلا کے سوانگ سے تعبیر کرکے ہمارے ایمان کا مضحکہ اُڑاتے ہیں تو اس میں بُرا ماننے اور تیوریوں پر بل ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا میرے برادرانِ ملت اس سے انکار کرسکیں گے کہ عقائد کا یہ غلو، خواہ کیسے ہی حسنِ نیت پر مبنی سہی، اسلام کی تعلیمات سے اُس کو کوئی دور کا بھی تعلق ہوسکتا ہے؟ وہ اسلام جسے قرآن نے سمجھایا، وہ اسلام جسے احادیث صحیحہ نے پھیلایا، اور وہ اسلام جسے آئمہ اہل بیت نے عملی طور پر پیش کیا۔

اُنھوں نے خدا کو منوانے کے لئے جانیں دی تھیں، ہم تعزیوں کے لئے انسانی قربانی کو حلال سمجھتے ہیں، اُنھوں نے توحید کے لئے دُنیا بھر کی مصیبتیں اُٹھائی تھیں، ہم تعزیہ، علم اور مزاروں کے پجاری بنے ہوئے ہیں، اُن کا حق وصداقت شعار تھا، ہمارا دُنیا طلبی ودہر پرستی، وہاں ابن ملجم کے جیسے شقی کی پیاس کو اپنی پیاس پر مقدم سمجھا جاتا تھا، ہم اپنے جذبات کی پیاس بجھانے کے لئے انسانیت کا خون پینے پر تیار ہیں، وہاں عنتر کے جیسے دیو پیکر کو قبضہ میں آنے کے بعد چھوڑ دیا جاتا تھا اور ہم ایک دوسرے کو ذبح کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں، اگر آپ فی الواقع اُسی کے پیرو ہیں جو اماموں کا امام ہے جو فرزند رسول ہے

جو فاطمہ کا لاڈلا ہے، جو علیؑ کا لختِ جگر ہے، جو جوانانِ جنت کا سردار اور محبوبِ خدا ہے تو بسم اللہ آیئے اور اپنے گھرانے کی تعلیم کو تازہ کیجئے حق و صداقت کے میدان میں اپنے عمل اور اپنی موحدانہ سیرت سے دُنیا کو وہ درس دیجئے جو آپ کے مولا نے دیا تھا، اور آپ کو وراثتاً پہونچا ہے، تعلیماتِ حسینی کی تبلیغ سے باطل کی تاریکیوں کو دور کیجئے، سخیف اور نجس اوہام سے اہل دُنیا کو بچایئے اور حسینؑ کے اسوۂ حسنہ کو دُنیا کے اس سرے سے اُس سرے تک پہونچا دیجئے، ورنہ صرف رو لینا، تعزیہ داری کے رسوم کا پابند ہو جانا، اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیز (دل) کے سامنے سر جُھکانا اور مٹی کے ڈھیروں کو صنم خانہ بنا کر دنیوی اغراض کو پورا کرنے کی التجا کرنا، میرے نزدیک اسلام کی توہین اور شیعیت کی تذلیل ہے۔

درگاہوں اور امام باڑوں میں حاضری، اکتسابِ سعادت کے لئے داخل حسنات سمجھی گئی تھی یہی مقصد اگر اب بھی ہو تو اس کی خوبی سے کس کو انکار ہو سکتا ہے لیکن اب تو مسلمانوں کا وہ حاملِ توحید گروہ جس کی جبینیں صرف بارگاہِ صمدیت کے لئے وقف تھیں وہ اب ہر کس و ناکس کے آستانہ پر جُھکتا رہتا ہے، وہ دل جو حریمِ الٰہی سمجھے گئے تھے اب نہ جانے کن کن معائب و معاصی کا مسکن ہیں، وہ نگاہیں جو معرفتِ ربانی کی لطافتوں سے جھوما کرتی تھیں اب کیف و کم کے اسرار کو بھول کر دنیا کے قدموں پر نچھاور ہو رہی ہیں، غرض اب یہی حشو و زوائد ملتِ حنیف کے اجزائے ترکیبی بنکر رہ گئے ہیں اور اسی پر اسلام کے نام لیوا (شیعہ ہوں یا سنی) سب زندہ ہیں، افسوس اس کا ہے کہ اپنے منہ سے علم بردارانِ توحید ہونے کا بھی دعویٰ کرتے ہیں اور عمل کے لحاظ سے وہ کام کرتے ہیں، جن سے قرآن ساکت احادیث خاموش اور اہلِ بیت کی تعلیم بیزار ہے۔

ہر فرقہ اگر اپنی اپنی جگہ غور کرے گا تو ہزارہا ایسے معائب ملیں گے جو اسلام اور تعلیم اسلامی سے دور کی بھی نسبت نہیں رکھتے جس کا یہ نتیجہ ہے کہ توحید ربانی کے روشن خد و خال چُھپ گئے اور مسلمان رفعت کے بلند کنگرہ سے گر کر پستی کے عمیق غاروں میں کھو گئے ہیں، سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ یہ قیاسی اُصول دل و دماغ میں اتنے زمانۂ دراز سے پرورش پا رہے ہیں کہ اب ان کی مضبوط جڑیں ہلائے نہیں ہلتیں، اور ان کے خلاف لب کشائی گویا طعن و تشنیع کا ہدف بنتا ہے اور کافر و زندیق کے القاب کا مستحق ہوتا ہے،

کاش دینِ حنیف کے پیرو صرف اس پر غور کر لیں کہ اسلام کیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ سوال جسقدر پیچیدہ بنا دیا گیا ہے، اُسی قدر آسان بھی ہے، اسلام نام ہے توحید ربانی کا، اللہ کی بھیجی ہوئی کتابوں پر ایمان لانے کا، اللہ کے اُن پاک نہاد بندوں کی صداقت کو تسلیم کرنے کا جو بنی نوع کی رہنمائی کے لئے بھیجے گئے تھے، اسی کو رسالتمآب نے ذہن نشین کرایا، اسی کو خلیفۂ رسول نے پیش کیا، اور اسی کو حسینؑ کی

شہادت نے سمجھایا، اس درجہ سہل العمل اور آسان اُصول مذہب کو کج بحثیوں نے ایسا مسخ اور ناہموار کر دیا ہے کہ باطل پرست اقوام بھی اس کا مضحکہ اُڑا رہی ہیں، اس لئے صرف اتنا کیجئے توحید پر جمے رہئے، اور اسوۂ پیغمبر کو اپنا راہنما بنا لیجئے۔

کیا علیؓ کا فقر و فاقہ اور صبر و ضبط اسی لئے تھا کہ آخر میں اُنھیں کی جماعت اوہام باطل کا شکار ہو جائے کیا حسینؓ کی شہادتِ عظمیٰ کا یہی مقصد تھا کہ ان مجاہدین حق کی نسلیں حق و باطل میں امتیاز نہ کر سکیں اُن کے ضمیر منیر میں تو خدائے واحد کے سوا کسی اور کا تصور بھی نہ تھا، انھوں نے تو صرف ایک خدا کے سامنے سر عبودیت جھکانے کی تعلیم دی تھی، خدا کا گھر اپنی پرستاری کے لئے نہیں، بلکہ خدا کی پرستش کے لئے بنایا تھا اور کیا نصیری گے جیسے مجنوں محبت کا انجام میرے اس دعوے کی دلیل نہیں ہے۔

باور کیجئے کہ باطل کی قوتیں ہمارے خلاف اجتماعی محاذ تیار کر چکی ہیں، اور ہمیں صفحہ ہستی سے مٹا دینے کے لئے تیار ہیں، اگر ہم اب بھی نہ سنبھلے تو یاد رکھئے کہ حق کی شکست ہمارے کمزور ہاتھوں سے ہو کر رہے گی اسلام آپ سے صرف "حسنِ عمل" کا طالب ہے اور اُس توکل کا جو انسان کو خدا کے سوا ساری فانی قوتوں سے بے نیاز کر دیتا ہے، ثابت قدمی کے ساتھ اس راستہ پر جم جائیے، آپ اگر حسینؓ کی شہادت کو لا الہ کی بنا جانتے ہیں، آپ اگر حکیم علی الاطلاق کے درسِ قرآنی کو اپنا راہنما سمجھتے ہیں تو اپنے قول و عمل سے دنیا کو دکھا دیجئے کہ ہم صرف خدا کے ماننے والے ہیں، رسولؐ کی رسالت پر ایمان لانے والے ہیں، علیؓ کی شجاعت و بسالت پر جان چھڑکنے والے ہیں، اور سید الشہدا کی تعلیمات شہادت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنانے والے ہیں، بقیہ رسم و رواج ذہن انسانی کا ایک مشرکانہ مغالطہ ہیں اور قرآنی تعلیمات کا مضحکہ۔

میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ یکایک ڈاکٹر امبیڈکر کا ایک بیان میری نظر سے گزرا جس نے ان خیالات میں ایک اور تازیانہ لگا دیا، ذرا اُسے بھی سُن لیجئے:۔

> "بلاشبہ اسلام فی نفسہ بہترین مذہب ہے لیکن اگر میں اسلام اختیار کرنا چاہوں تو مجھے سب سے پہلے یہ عقدہ حل کرنا ہوگا کہ شیعہ بنوں یا سُنی، تبرؔوں کو پوجوں یا خدا کو؟ مسلمان مختلف فرقوں میں اس طرح تقسیم ہو گئے ہیں کہ ہر فرقہ دوسرے فرقہ کو کافر کہتا ہے، میں جانتا ہوں کہ جس جوش سے تعزیوں اور قبروں کو پوجا جاتا ہے اگر میں وہ جوش ظاہر نہ کر سکا تو مجھے وہابی کہکر اسلام سے خارج کر دیا جائے گا، دوسروں کو مسلمان بنانے سے پہلے مسلمانوں کو چاہئے کہ خود مسلمان بن جائیں اور اپنی اندرونی تفرقہ دور کریں"

آپ نے دیکھا یہ الفاظ اُس شخص کی زبان سے ادا ہوئے ہیں جس کی طرف ہندوستان کی تقریباً ہر قوم کی

نظریں لگی ہوئی ہیں اور جس سے ملک کے ایک کثیر الافراد طبقے کی تقدیریں وابستہ ہیں۔

ڈاکٹر امبیڈکر چھوت چھات اور انسانی تفریق کی بنا پر اپنے قدیم مذہب سے بیزار ہیں اور اپنی سوشل حیثیت کی ترقی اور تعمیر کے لئے چاہتے ہیں کہ ایسا مذہب اختیار کریں جو انھیں نوعِ بشری میں برابری کی سطح پر رکھ سکے، قدرتاً اُن کی نظر پہلے اسلام کی طرف اُٹھنی چاہیے تھی کیونکہ اسلام نہ صرف اُن کا قدیم پڑوسی ہے بلکہ اُسکی قرآنی تعلیم اُن کے مرض کا علاج بھی کر سکتی ہے اور اُن کو انسانیت کی صف میں مساوات کا درجہ بھی دے سکتی ہے لیکن جب اُنھوں نے خود مسلمانوں میں وہی اختلافات دیکھے اور وہی فقدان توحید پایا جس کی بنا پر اُنھیں اپنے مذہب سے شکایت ہے تو اُن کو مجبوراً کہنا پڑا کہ:۔

"دوسروں کو مسلمان بنانے سے پہلے مسلمانوں کو چاہیے کہ خود مسلمان بن جائیں۔"

مسلمانوں کے لئے اس سے بڑھ کر شرمناک موقع اور کونسا ہو سکتا ہے کہ دُنیا اُنھیں مسلمان بھی نہیں سمجھتی میرے قلب میں نشتر چبھ رہے ہیں، عرقِ انفعال میں ڈوبا جا رہا ہوں اور سوچتا ہوں کہ مسلمانوں کو یہ توفیق کب حاصل ہوگی کہ وہ اپنی تفریقوں کو دور کر سکیں گے، فرقہ وارانہ ذہنیت کو مٹا سکیں گے اور صرف مسلم ہی رہ کر زندہ رہیں گے، مسلم ہی کے لفظ سے قرآن نے بھی اُنھیں مخاطب کیا ہے، اس کے ہوتے ہوئے انسانی دماغ کے اجتہادات ناقص ہی نہیں میرے عقیدے کے لحاظ سے ٹھکرا دینے کے قابل ہیں، کیونکہ وہ صرف مسلمان ہی تھے جنھوں نے ساری کائنات کو اپنے سایہ میں لیکر اخوت و مساوات کی تعلیم دی تھی اور اغیار کو انصار بنا لیا تھا مگر افسوس کہ وہ تعلیم ۷۲ ٹکڑوں میں منتشر ہو کر ذراتِ بیابانی کی طرح پریشان ہو گئی ہر چند ہمارا دعویٰ یہی ہے کہ

"اسلام بہترین مذہب ہے"

لیکن ہمارا عمل بتاتا ہے کہ "خدائی تعلیم" کو بھول کر ہم اسلام کو رسوا و بدنام کر رہے ہیں، کوئی قبر پرستی کی دعوت دے رہا ہے اور کوئی تعزیہ و علم کی پرستش میں کھویا ہوا ہے!

غور کیجیے کہ جو بات ہمارے سمجھنے کی تھی اُس کو دوسروں نے آخر پا ہی لیا، ڈاکٹر امبیڈکر نے اسلام کو تو سمجھا لیکن ہمارے عمل کو دیکھ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہونے سے احتراز کر رہے ہیں، اگر مسلمان، مسلمان ہوتے اور تفریقوں نے اُن کی وحدت کو کثرت میں سمو نہ دیا ہوتا تو آج دنیا اُن کی طرف بیتابانہ دوڑتی، مگر رونا تو اس کا ہے کہ ہمارے اعمال و افعال نے ہم کو مسلمان بھی نہ رہنے دیا جس کی وجہ سے ہم تباہی کے اُس آخری زینہ پر بے سہارا کھڑے ہوئے ہیں کہ ـــــ "اب گرے اور تب گرے"

اب سے پہلے نہ معلوم کتنی قومیں اپنے انھیں اعمال کی بدولت فنا کے گھاٹ اُتر چکی ہیں، یہی حالت سُنّی شیعہ مسلمانوں کی ہے جن کی خدائی کتاب مخملی جزدانوں کے اندر نہایت احترام سے رکھی جاتی ہے اور

محراب و منبر کی زینت بھی ہوتی ہے، نہ اُس کو کوئی سمجھتا اور نہ اُس کو کوئی کھولتا ہے، رہ گئے رسالتمآب کے ارشادات سو اُن پر موضوع و معتبر کے حاشیہ چڑھا چڑھا کر نہ معلوم اُنھیں کیا سے کیا بنا دیا جس کا یہ نتیجہ ہے کہ آج سنی و شیعہ مسلمان پیغمبر اسلام کے اسلام سے منزلوں دور جا پڑے ہیں۔

یقین کیجئے کہ اگر ہم اب بھی بیدار نہ ہوئے اور قرآنی تعلیم پر ہمارا ایمان قایم نہ ہوا صحیح ارشادات نبویؐ کو نہ سمجھ سکے، علیؑ کی صداقت کی پیروی نہ کر سکے حسینؑ کی شہادت سے سبق نہ لے سکے تو قہر خداوندی ہم پر نازل ہو کر رہے گا اور عذاب الٰہی کا کوئی جھونکا ہمیں خس و خاشاک کی طرح اُڑا لیجائے گا اور ہماری کفر آفرینیاں ہمیں اس طرح گم کر کے رہیں گی کہ شاید آنے والی نسلیں ہمارا پتہ بھی نہ لگا سکیں۔

خدا وہ وقت نہ لائے!

ہوش بلگرامی

(نگار) یہ مقالہ ہمارے فاضل دوست مولانا ہوش بلگرامی کا ہے جو مذہبًا چاہے کچھ ہوں لیکن نسل و تربیت کے لحاظ سے یقینًا شیعہ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آج اسلام کے صحیح خد و خال بدعات و زوائد کے غبار میں اس قدر نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں کہ اگر یہی جذبات کسی سنی کی طرف سے ظاہر کئے جاتے تو حضرات شیعہ غالبًا اس کی تاب نہ لا سکتے اور اسے عصبیت پر محمول کرتے۔ لیکن یہ قدرت کا انتظام ہے کہ جب تاریکی حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو اسی فضا میں کچھ اسباب روشنی بھی پیدا ہو جاتے ہیں اور اسی ردّ عمل کے مختلف مظاہر کو بہ لحاظ مراتب۔ رسالت و امامت، اجتہاد و تفقہ، اور فکر و غور کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

مانا کہ رسالت کا دور ختم ہو چکا اور امامت فی زماننا پردۂ خفا میں ہے، لیکن اجتہاد و تفقہ تو موجود ہے (اگر وہ صرف عبائے سیاہ کا نام نہیں) عقل و شعور تو مفقود نہیں ہوئے (اگر مذہب نام ذہنی غلامی کا نہیں) اور بنابراں فراستِ انسانی سے اس کا یہ حق کبھی نہیں چھینا جا سکتا کہ جو راہِ عمل اس کے لئے متعین کی جاتی ہے، پہلے اس کے نشیب و فراز کو اچھی طرح سمجھ لے اور ارباب اجتہاد کا فریضۂ اولین ہے کہ جب کوئی مطالبۂ عقلی ان کے حضور میں پیش کیا جائے تو وہ عقل و فراست سے بھی کام لیں اور اُس جرأت و ہمت سے بھی جو احکام عقل کے نفاذ کے لئے عقل سے زیادہ ضروری ہے۔

شیعی جماعت کے ارباب اجتہاد بھی اُصولاً اسوۂ حسینی کا وہی مفہوم قرار دیتے ہیں جو فاضل

مقالہ نگار نے بیان کیا ہے اور ان سے خلوت میں گفتگو کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی ان تمام مراسم عزاداری کو جن کا ذکر اس مضمون میں کیا گیا ہے بُرا سمجھتے ہیں لیکن اگر ان سے پوچھئے کہ وہ اس باب میں عوام کی رہبری کیوں نہیں کرتے، ان لغو و شرمناک مراسم کا سد باب کیوں نہیں چاہتے، تو وہ ایک سے زاید "عذرِ نارسائی" پیش کر دیتے ہیں، حالانکہ حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ مولوی ہر جگہ مولوی ہے خواہ وہ قبائے تشیع میں جلوہ افروز ہو خواہ عبائے تسنن میں۔

وہ سمجھتا ہے کہ ان تمام اسماء میں جن کا ذکر "علم آدم الاسماء کلہا" میں پایا جاتا ہے سب سے پہلا اسم جس کی آدم کو تعلیم دی گئی اسمِ ذات تھا یعنی اپنی ذات کی حفاظت، اپنے تشخص کی تعیین، اور اپنے داعیاتِ نفس کی رعایت - اس لئے کوئی ایسا قدم اٹھانا جو اس کے ذاتی اغراض و مصالح کے منافی ہو اس کے نزدیک نہ صرف کفرانِ نعمت بلکہ خدا کی نافرمانی میں شامل ہے۔

پھر آپ کسی مولوی یا مجتہد کو دیکھئے یہی حال اس پر غالب نظر آئے گا، اور اسی کی نمایش کی غرض سے وہ اپنے آپ کو ایسی ہیئت میں پیش کرے گا گویا ساری دنیا سے علٰحدہ کوئی اور مخلوق ہے جو باوجود انسان پیدا ہونے کے اپنے آپ کو انسان کہلانا اپنی توہین سمجھتا ہے جو باوجود اس زمین پر سانس لینے کے اپنے آپ کو آسمانی مخلوق قرار دیتا ہے۔ وہ الجھی ہوئی ریش دراز، وہ خشک و عبوس چہرہ، وہ پُر شکن پیشانی، وہ طویل الذیل عبائے خاکروب، وہ پُر خشونت اندازِ تکلم وہ خدائے قہار کی شان جلالی ظاہر کرنے والی ہیبت ناک آنکھیں، وہ فرعون کو شرما دینے والی ادائے خرام - الغرض یہ اور اسی قسم کی بہت سی خصوصیات جو گویا ہر وقت پکار پکار کر یہ اعلان کر رہی ہیں کہ "دیکھو ہم آ رہے ہیں" اس قوم کے وہ معمولات ہیں جو ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے جدا نہیں ہوتے اور مقصود صرف یہ ہے کہ لوگ اپنے سے بلند و ممتاز سمجھ کر ان کی غیر معمولی عزت کریں اور اپنا ذریعۂ نجات جان کر ہر قسم کی ایثار و قربانی کا مرکز انھیں قرار دیں۔

اب غور فرمایئے کہ اگر یہ لوگ عوام کے ان اوہام باطلہ کو دور کر دیں اور صحیح علم کی روشنی میں مذہب کا مفہوم انھیں بتائیں تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا، صرف یہ کہ سوسائٹی میں مساوات پیدا ہو جائے گی، اور علمائے مذہب کا خود ساختہ تشخصِ علم و اجتہاد باقی نہ رہے گا، جسے وہ کبھی گوارا نہیں کر سکتے، ان کے دسترخوان کا تنوع، ان کے ملبوس کی رونق، ان کی خلوتوں کی رنگینی اور ان کا چار نکاح پر بھی بس نہ کر سکنے والا ہیجان، محض عوام کے جہل و باطل پرستی پر قایم ہے اور ان چیزوں کا دور ہو جانا اس طبقہ کی موت ہے۔

پھر اسوقت ضرورت اس کی نہیں ہے کہ مسلمانوں کے جہل و گمراہی پر روشنی ڈالی جائے کیونکہ یہ تو کھلی ہوئی حقیقت ہے بلکہ وقت یہ سوچنے کا ہے کہ علماء مذہب کے اقتدار کو کیونکر محو کیا جائے، ان عمامہ پوش بتوں کو کیونکر مسمار کیا جائے کہ قوم کے جہل اور اس کی تباہی و بربادی کی ذمہ دار جماعت تنہا صرف یہی ہے۔

ایک بار یہیں لکھنؤ کے ایک شیعی عالم سے گفتگو ہوئی تو انھوں نے بھی مروجہ مراسم عزاداری کی مذمت بیان کی، لیکن اس کے بعد ہی امامیہ مشن لکھنؤ کی طرف سے (جس میں ان حضرت کا کافی اثر ہے) ایک رسالہ شایع ہوا، جس میں عزاداری کی تمام مروجہ صورتوں کو نہ صرف مستحسن بلکہ ضروری قرار دیا گیا تھا۔ پھر جس قوم کے علماء کے ظاہر و باطن کا یہ حال ہو اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اصلاح کی طرف متوجہ ہوگی، کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اور اس لئے اب صورت صرف یہی رہجاتی ہے کہ عوام کو ان کے اثر سے آزاد کر کے خود ان کو سمجھنے کا موقعہ دیا جائے اور علم و روشنی کی راہ میں جو یہ "حجابات تقدس" حایل ہو گئے ہیں انھیں دور کر کے افرادِ قوم میں ذہنی بیداری پیدا کی جائے۔

میں اکثر مجالسِ عزا میں شریک ہوا ہوں اور بارہا "واعظین محراب و منبر" کے مواعظ سنے ہیں، لیکن میرے سامنے کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ہے کہ انھوں نے مراسم عزاداری کی اصلاح کی طرف عوام کو مایل کیا ہو اور صحیح اسوۂ حسینی پیش کرنے کی زحمت گوارا فرمائی ہو۔ پھر چونکہ انکا تنہا مقصود لوگوں میں کیفیت گریہ و زاری پیدا کر کے ان کے قواء عمل کو اور مضمحل بنا دینا ہوتا ہے، اس لئے وہ بیسیوں بزعم خود صحیح روایتیں بیان کرنے میں تو بہت دلیر نظر آتے ہیں، لیکن لوگوں میں صحیح ولولۂ عمل اور صداقت پرستی پیدا کرنے کے لئے انکے پاس کوئی جھوٹی روایت بھی نہیں ہوتی۔

سُنّی جماعت کی حالت اس سے بدتر ہے کیونکہ کثرت آبادی کے لحاظ سے ان میں علماء بھی اتنے ہی زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اگر شیعوں کے یہاں بُت پرستی صرف عشرۂ محرم میں ہوتی ہے تو سنیوں کے یہاں تمام سال ہوتی ہے، اگر اہل تشیع کے بُت صرف تعزیہ و علم ہیں تو اہلِ تسنن کے یہاں ہر پختہ قبر یہی حکم رکھتی ہے۔

فاضل مقالہ نگار چونکہ شیعہ جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے وہ اس کا رونا روتے ہیں، میں چونکہ کسی طبقہ سے تعلق نہیں رکھتا اس لئے تمام عالم اسلامی کا رونا روتا ہوں ——— وہ دُعا کرتے ہیں کہ "خدا وہ وقت نہ لائے" اور میں سمجھتا ہوں کہ "وہ وقت آگیا ہے" اور قدرت کو جو فیصلہ کرنا تھا وہ ہو چکا ہے۔

جف القلم بما ہو کائن لہ

مکتوبات نیاز

صدیقی - عتاب نامہ ملا - حیران ہوں کیا کروں - آپ معذرت سننے سے رہے اور میں الزام تسلیم کرنے سے - وہ آپ کے دعوائے فرزانگی کے منافی ہے اور یہ میری خودداری کے خلاف - پھر گتھی سلجھے تو کیونکر؟ ایک تدبیر میرے ذہن میں آئی ہے، آپ اس پر کاربند ہوں یا نہ ہوں لیکن سن لینے میں کیا حرج ہے -

آپ ایک خط رشید صاحب کو لکھئے - ظاہر ہے کہ ان سے زیادہ میرا دشمن اور کوئی نہیں — اور انھیں سے پوچھئے کہ قصور کس کا ہے - میرا یا اُن حضرت کا جن کی معصومیت کو آپ ریاضی کا ایک مسلمہ مسئلہ مانتے ہیں -

میں نے ان کو خط لکھا جواب نہیں دیا، آدمی بھیجا کوئی توجہ نہیں کی، خود گیا مگر باوجود وعدہ تشریف نہیں لائے - اب بتائیے کیا کرتا - میں نے ان سے کہدیا تھا کہ نواب صاحب پرسوں چلے جائیں گے اور کل کا وقت مقرر ہو چکا ہے، لیکن صبح سے دوپہر تک انتظار کرتا رہا، تشریف نہیں لائے -

مجھے جستجو ہوئی کہ کیا بات ہے - معلوم ہوا کہ وہ اس سے قبل خود براہ راست ملنے چلے گئے تھے اور وہاں سے مایوس واپس آئے - پھر اب کیا منھ لیکر جاتے اور اپنی اس خفت کو مجھ پر کیونکر ظاہر کرتے — کیا بتاؤں کتنا افسوس ہوا ہے، میں تمام مراحل زبانی طے کر چکا تھا اور کامیابی کی پوری توقع تھی لیکن اس کا کیا علاج کہ اپنی حماقت سے انھوں نے تمام بنا بنایا کھیل بگاڑ کے رکھدیا -

اگر اس کے بعد بھی آپ مجھے موردِ عتاب قرار دیں، تو یہ آپ کی محبت ہے - اور کیا کہہ سکتا ہوں -

---

مکرمی - آپ نے بھی کس ظالم کا ذکر کیا - مجھ سے پوچھئے کہ وہ حضرت کیا ہیں اور کیا نہیں - ان کے انسان پیدا ہونے میں کلام نہیں لیکن ایک بے روح انسان — جس کی تنہا مسرت زندہ چیزوں کو کچلکر گزر جانا ہے - اب کیا بتاؤں میں نے کیسی کیسی بیدردیاں اس شخص کی دیکھی ہیں - آپ کو وہ ہستی یاد ہوگی جو اپنی صحت، اپنی مسرت اپنی زندگی اور اپنا وہ سب کچھ (جس کا سودا کونین کے عوض بھی گراں نہ تھا) اسپر قربان کر چکی تھی - پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ جس وقت وہ نزع کے عالم میں تھی تو ان کی بے نیازیوں کی کیا کیفیت تھی -

ایک دن میں نے کہا کہ "پھول کی پنکھڑیاں توڑنے کے بعد انھیں مجتمع کر کے آپ پھر پھول نہیں بنا سکتے" بولے کہ "چمن میں جب تک پھولوں کی پیداوار بند نہیں ہوئی، اس پر غور کرنا حماقت ہے"۔

آپ اسے ذہن انسانی کی گمراہی بتاتے ہیں، میں قدرت کی ستم ظریفی کہتا ہوں، اور خدا کو نہ ماننے والے اس کو "عدمیت" کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔

اندھیر ہے، ظالم کا ظلم جاری ہے اور اس کی کوئی سزا نہیں، مظلوم کی کراہوں سے فضا گونج رہی ہے اور کوئی سننے والا نہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ اس کا فیصلہ دوسری دنیا میں ہوگا، اس کی مصلحت آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ فیصلہ کرنے والے کا ہاتھ یہاں کس نے پکڑا تھا کہ وہاں چھوڑ دے گا۔ خیر، اس قصہ کو جانے دیجئے، یہ بتائیے کہ آپ کی اُن کی یکجائی کیونکر ہو گئی۔ میں سننا چاہتا ہوں، بہت لطیف داستان ہو گی۔

مجھے تو ان سے ملے ہوئے ایک زمانہ ہو گیا، لیکن سنتا ہوں کہ خوش ہیں، اچھے ہیں۔ آپ کو اگر اور زیادہ تفصیلی حالات معلوم ہوں تو مطلع فرمائیے، مجھے ان سے اور ان کے واقعات زندگی سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے اور رہے گی

اے حضرت ، یہ آپ میری طرف سے اس قدر مایوس کیوں ہیں۔

چشم ہماں قوت دیدش ہماں !

مجھے یاد کر کے تو دیکھئے، اس طوفانِ آب و رنگ سے، کون ہے، جو اپنی جان سلامت لے آئے گا؛ اس کی گلی میں جانے کے لئے کون اپنے "دین و دل" کو عزیز رکھے گا۔ مگر میں خوب جانتا ہوں یہ سب جی جلانے کی باتیں ہیں ورنہ آپ

دشمن کے ساتھ صرفہ کریں رسم و راہ میں

مجن صاحب کا حال سنکر بہت ملال ہوا۔ اللہ، اللہ، وہ بزم جہاں سوائے رندان باصفا کے اور کسی کا گزر نہ تھا، آج وہاں "خرقۂ سالوس" کی حکومت ہے۔

عبرت آتی ہے کہ کیا بتخانہ ویراں ہو گیا !

دیکھئے تاریخیں یونہی تو غلط مرتب ہو جاتی ہیں۔ انجام خراب ہوگا ان کا اس صحبت سے اور دنیا سمجھے گی کہ ان کو تباہ کیا زندیق نے۔ میں تو کہہ دیجئے کہ آپ کس دھوکے میں مبتلا ہیں، روح کی تشنگی کو وہی چیز بجھا سکتی ہے جس نے اس تشنگی کو پیدا کیا ہے۔

پاک ست خرقہ کہ بہ مے شستہ و شو کنند

خوشا نصیب، کہ آخر کار آپ کو اس دور افتادہ پر رحم آ ہی گیا۔ آپ نہ سہی آپ کے الفاظ تو ہیں،

ما لذتِ دیدار ز پیغام گرفتیم
مشتاق تو دیدن ز شنیدن نشناسد

حقیقت یہ ہے کہ مجھے آپ کی بے اعتنائی کا اتنا گلہ نہیں ہے، جتنا اپنی شکستہ پائی کا، کیونکہ میرے پاس سوائے خاموشی کے کوئی عذر نہیں اگر آپ میرے شکوہ و شکایت کے جواب میں یہ کہہ دیں کہ "گر میں نے کی تھی توبہ" تو نا معقول تجھے کیا ہوا تھا۔

بہر حال میرے لئے یہ مسرت بھی کم نہیں کہ آپ کو میرے اس "رنجِ دوری" کا احساس ہے۔

آپ نے جس امر میں میری سعی چاہی ہے، وہ اس حیثیت سے کہ یوسف کی "دل باختگی" اس سے متعلق ہے، یقیناً لائقِ توجہ ہے، لیکن انجام کے لحاظ سے مجھے زیادہ پسند نہیں۔ ان کے لئے تو یہ تعلق باعثِ صد ہزار شرف ہے، لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے سلطانہ آسانی سے راضی نہ ہوگی اور جبر و اکراہ کے ساتھ "ہاں" کر بھی دی تو تعلقات کی شگفتگی معلوم۔

میں یہ جانتا ہوں کہ وہ "تعلیم یافتہ" ہے "تعلیم زدہ" نہیں اور والدین کی مرضی کی خاطر وہ اپنے دل کو مجبور بھی کر سکتی ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ "یوسف" کی ملاقات سے بہت پہلے وہ کسی اور سے "پیمانِ محبت" کر چکی ہے اور حتی المقدور وہ اسے نباہنے کی کوشش کرے گی۔

پھر اگر آپ سودا صرف جسم کا کرنا چاہتے ہیں، دل کا نہیں، تو میں کوشش کے لئے آمادہ ہوں، ممکن ہے بار آور ہو جائے، لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ آپ کا گھر ماتم کدہ بن جائے گا اور ممکن ہے کہ یوسف بھی اس رسوائی کو برداشت نہ کر سکیں۔

یقیناً معاملہ بہت نازک ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یوسف کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ وہ چیز ہی ایسی ہے۔ لیکن تمناؤں کا خون ہو جانا بھی تو کوئی نئی بات نہیں۔ بہر حال ایک نفسیاتی تدبیر میرے ذہن میں آئی ہے وہ یہ کہ آپ انہیں میرے پاس بھیج دیجئے تاکہ وہ خوب سیر ہو کر دیکھ لیں، ممکن ہے "نگاہِ اولین" کا عشق "نگاہِ ثانی" کے بعد کچھ ہلکا پڑ جائے، اور اس کا بھی امکان ہے کہ تکلف ٹوٹنے کے بعد "تبریاہٹ" اتنی باقی نہ رہے۔ ان سے کہئے کہ کچھ تو شرم اپنے نام کی رکھیں۔ ایسی بھی کیا بیتابی ہے۔ زلیخا وہی ہے جو اپنے اوپر جان دے۔

یہ کیسے یوسف ہیں کہ خود زلیخا کے لئے مٹے جا رہے ہیں۔

گرامی جناب — والا نامہ پہونچا۔ شکریہ۔ مشورہ درست ہے لیکن کیا کروں،

ہمت نہ خورد نیشتر لا و نعم را

آپ کو معلوم نہیں، میں جانتا ہوں کہ اس باب میں، کتنی بدسلیقگی مجھے عطا ہوئی ہے۔ کیا ہجوم افکار میں مبتلا رہنا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ کیا میرا جی نہیں چاہتا کہ میں بھی دادِ عیش دوں، لیکن جسوقت یہ دیکھتا ہوں کہ اس مقصد کے حصول کے لئے کیسی کیسی قربانیاں پیش کرنے کی ضرورت ہے، تو اپنی بیکسی و بیچارگی کے ساتھ میری محبت اور بڑھجاتی ہے۔

میں ناشکر گزار نہیں ہوں، لیکن میری التجا یہی ہے کہ کسی ایسی بات پر مجھے مجبور نہ کیجئے کہ آخر کار خود مجھے اپنی اوقات سے نفرت ہونے لگے — آپ کی دل پرسی کا مکرر شکریہ۔

مجمع الادب، اسماعیل کالج جوگیشوری کا

”انعامی مقابلہ“

اسماعیل کالج میں ۷ر فروری کو جو ”یوم ولی“ منایا گیا تھا اس کو عملی و علمی صورت سے مستقل و مفید بنانے کے لئے مجمع الادب نے یہ طے کیا ہے کہ ملک کے ادیبوں، انشاپردازوں اور مضمون نگاروں سے درخواست کیجائے کہ وہ مندرجہ ذیل موضوع پر اظہار خیال فرمائیں۔ جو مضامین سب سے اچھے سمجھے جائیں گے انکے لئے معقول انعامات پیش کئے جائیں گے۔ انشاپردازوں کے علاوہ تمام طلبہ سے بھی درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اس موضوع پر لکھیں طلبہ کے مضامین میں سے بھی سب سے اچھے دو مضامین میں اول کو ایک سونے کا تمغہ اور دوسرے کو چاندی کا تمغہ دیا جائے گا۔ موصولہ مضامین میں سے چند مضامین ایک کتاب کی صورت میں شایع کئے جائیں گے۔ مضامین مندرجہ ذیل پتہ پر یکم جولائی ۳۷ء۱۹ تک پہونچ جانا چاہئے۔ طلبہ کو اپنے مضامین اپنے کالج یا اسکول کے اعلیٰ افسر کے ذریعے روانہ کرنا چاہئے۔ کوئی ایسا مضمون جو کہیں پڑھا جا چکا ہے روانہ نہ کیا جائے۔

(۱) اُردو ادب و شاعری میں ولی کا درجہ۔ (۲) ولی سے پہلے گجرات، دکن اور شمالی ہند میں اُردو کا درجہ۔ (۳) ولی کی لسانی، ادبی، سماجی اور شعری خدمات۔ (۴) موجودہ اُردو ادبیات پر ولی کا اثر۔

مجمع الادب ۔ اسماعیل کالج جوگیشوری۔
۲۰ر فروری ۳۷ء۱۹۔

نجیب اشرف ندوی
صدر شعبۂ اُردو

لامذہبیات

آجکل کے ملحدین کیا کہتے ہیں ؟

(بہ سلسلۂ ماسبق)

دو راستوں میں کونسا راستہ اختیار کرنا چاہئے ؟

ہمارے سامنے دو راستے ہیں ایک وہ جو فطرت اور عالم اسباب کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے اور دوسرا وہ جو مافوق الفطرت باتوں کی جانب مایل کرتا ہے ۔۔۔۔ یعنی ایک وہ ہے جو ہمیں تحقیق و جستجو، اکتشافات واختراع، سعی وکاوش اور رشتۂ علت ومعلول کی طرف متوجہ کرکے راحت و آسایش، امن و سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے اور دوسرا وہ جو ہمیں بتاتا ہے کہ اصل دنیا یہ نہیں ہے بلکہ کوئی اور ہے اور اسی غیر معلوم دنیا کے لئے بلا حیل وحجت ہمکو قربانیاں، دعائیں، اور عبادتیں کرتے رہنا چاہئے ۔

ان دونوں راستوں میں اور کیا فرق ہے ؟

ایک بتاتا ہے کہ زندگی نام ہے اپنے اور دیگر ابناء جنس کے ساتھ ہمدردی رکھنے اور ان کیلئے اسباب راحت وسکون فراہم کرنے کا ۔

دوسرا کہتا ہے کہ حیاتِ انسانی کا مقصد خداؤں اور دیوتاؤں کی پرستش ہے جو دوسری دنیا میں ہمارے اس تمام عجز وانکسار کا ابدی معاوضہ دیں گے ۔ ایک عقل وحقایق پر اعتماد کرنے کی ہدایت کرتا ہے اور دوسرا صرف عقاید پر بھروسہ کرنے کی ۔ ایک کہتا ہے کہ اپنے حواس وادراک کی اس روشنی سے کام لو جو خود تمھارے اندر پائی جاتی ہے، دوسرا کہتا ہے کہ اس مقدس روشنی کو گل کردو

بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید !

اس میں شک نہیں کہ ہمارے اسلاف نے جو کچھ کیا وہ اس سے زاید کچھ نہ کرسکتے تھے ۔۔۔ وہ ایک مافوق الفطرت قوت پر یقین رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اگر وہ طاعت وعبادت، دعا وقربانی نہ کریں گے تو

نہ بارش وقت پر ہوگی اور نہ ان کی کھیتیاں بارآور ہوں گی۔ وہ یقین کرتے تھے کہ خدا ایک مستبد بادشاہ ہے جس کو ذرا ذرا سی بات ناگوار ہو جاتی ہے اور جو برہم ہو کر سزا دینے پر اُتر آتا ہے۔ وہ خدائے خیر کے ساتھ، خدائے شر کے بھی قایل تھے اور انھیں دو خداؤں کے درمیان بیم و رجا کی "رعشہ براندام" زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ ان کی حیات کا کوئی لمحہ خوف سے خالی نہ گزرتا تھا اور ہر وقت وہ اسی ڈر سے کانپتے رہتے تھے کہ مبادا کوئی اُن سے خفیف سی خفیف گستاخی سرزد ہو جائے اور خدا ناراض ہو کر انھیں بڑی سی بڑی سزا کا مستوجب قرار دے۔

طوفان آتا تھا تو وہ سمجھتے تھے کہ نتیجہ ہے انھیں کی بداعمالیوں کا، زلزلہ آتا تھا تو وہ یقین کرتے تھے کہ خدا ان پر برہم ہو رہا ہے، وبائی بیماریاں پھیلتی تھیں تو وہ اسے بھی اپنے ہی گناہوں کی پاداش جانتے تھے اور جب چاند سورج کو گرہن لگتا تھا تو اسے بھی اپنی ہی خطاؤں کا نتیجہ باور کرتے تھے۔ تمام فضا انھیں فرشتوں یا خبیث روحوں سے معمور نظر آتی تھی اور شب و روز وہ صرف اس لئے الحاح و زاری کیا کرتے تھے کہ خدا ان سے خفا ہو کر تباہ و برباد نہ کر دے۔ قدرت ان کے نزدیک گویا ایک سوتیلی ماں تھی جو پیشانی پر شکنیں ڈالے ہوئے ہر وقت انھیں خونچکاں آنکھوں سے دیکھتی رہتی تھی۔

آخرکار ایک زمانہ آیا جب بعض افراد سوچنے والا دماغ لیکر پیدا ہوئے اور انھوں نے تمام حوادث و واقعات پر غور کرنا شروع کیا۔ انھوں نے سمجھا کہ طوفانوں اور زلزلوں کے اسباب طبیعی کچھ اور ہیں۔ سورج گرہن کے لئے ایک زمانہ معین ہے اور پہلے سے اس کے وقوع کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح رفتہ رفتہ سیاروں کی گردش، کرۂ زمین کے جغرافی حالات، آب و آتش کے خواص، مظاہر فطرت کے اسباب، حیات انسانی کی خصوصیات، اعضاء جسم کے وظایف معلوم کئے گئے اور واہمہ پرستی کی زنجیر کی کچھ کڑیاں ٹوٹیں۔

اس کے بعد کچھ زمانہ اور گزرا یہاں تک کہ مدارس کی بنیادیں پڑیں، کتابیں تصنیف کی گئیں، مفکرین کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی، علمی انکشافات نے انسان کے دماغ کو منور کرنا شروع کیا، فکر و خیال کی آزادی بڑھی اور مافوق الفطرت کی جگہ فطرت اور اُصول فطرت نے لیلی۔ پھر روح کے اس احساسِ آزادی کا جو نتیجہ ہونا چاہئے تھا وہ ظاہر ہو کر رہا یعنی اختراع و ایجاد کے دروازے کھل گئے اور ارباب مذہب اپنی اور اپنے اعتقادات کی کمزوریوں کو بُری طرح محسوس کرنے لگے۔

ظاہر ہے کہ مفکرین کے مقابلہ میں "معتقدین" کوئی علمی و عقلی دلیل تو پیش کر نہ سکتے تھے، کیونکہ یہی ایک چیز اُن کی دسترس سے دور تھی، اس لئے وہ اہل علم کے خلاف ملک میں نہایت مکروہ پروپیگنڈا کی اشاعت پر اُتر آئے اور واہمہ پرستی کے پاس جہل و تعصب کے جتنے گندے حربے موجود ہیں، ان سب کا استعمال بیک وقت شروع کر دیا گیا۔ ان کو ذریات شیطان بتایا گیا، خدا کا دشمن ظاہر کیا گیا، ان کے مٹا دینے کا نام

مذہبی جہاد قرار پایا اور استعمالِ آتش و زنجیر اور تعذیب و تذلیل کی جتنی مہیب صورتیں ہیں، وہ سب بروئے کار لائی گئیں۔

پھر یہ سب کچھ چند دن کا ہنگامہ نہ تھا، بلکہ خوں آشامیاں صدیوں تک جاری رہیں اور اس سلسلہ میں کوئی جرم ایسا نہ تھا جس کا ارتکاب مذہب کے نام پر جایز و مستحسن نہ قرار دیا گیا ہو۔ ایک فریق کہتا تھا کہ جذبات انسانی کو فنا کردو اور ضروریاتِ زندگی کو کم، اپنے آپ کو معذور سمجھو اور آسمانی قوت پر اعتماد کامل رکھ کر تمام کام اسی پر چھوڑ دو۔ دوسری جماعت کہتی تھی کہ جذبات انسانی اسی لئے پیدا ہوئی ہیں کہ مناسب حدود میں ان کو تسکین پہونچائی جائے اور ضروریاتِ زندگی کا بڑھانا بھی لازم ہے کیونکہ بغیر ان کے انسان کو اپنی قوتوں کا علم نہیں ہوسکتا اور دنیا میں کوئی ایجاد و اختراع معرض ظہور میں نہیں آسکتی۔

ایک فریق کا فلسفۂ حیات یہ تھا کہ مال و دولت کو ٹھکرا دیا جائے اور اسباب راحت سے نفرت کی جائے، یہ لوگ فنونِ لطیفہ کے دشمن تھے، اچھی غذا، اچھے لباس، اچھے مکانوں سے متنفر تھے، گویا یوں سمجھئے کہ یہ حکماء تھے غربت و افلاس کے، تشنگی و گرسنگی کے، جھونپڑوں کے، چیتھڑوں کے، برہنہ پائی کے اور ایک ایسے آہستہ روعملِ خودکشی کے جو دفعتاً نہیں بلکہ تدریجاً قوم کی قوم کو ہلاک کر دینے والا ہے۔ ان کو اس دنیا میں سوائے عذاب و مصیبت کے کچھ نظر نہ آتا تھا اور دوسری دنیا ہر قسم کے اسباب و نشاط و راحت سے معمور دکھائی پڑتی تھی۔ وہ امراء، اصحاب ثروت سے اور تمام ان لوگوں سے جو اپنی قوتِ بازو کی مدد سے راحت و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں نفرت کرتے تھے اور جنت میں سوائے گداگروں اور بھکاریوں کے کسی اور کا در خور محال سمجھتے تھے۔

الغرض یہ تھے وہ لوگ جنھوں نے دنیا کو ویران و غیر دلچسپ رکھنے کے لئے صدہا سال تک جہاد کیا اور کچھ زمانہ تک انھیں کامیابی بھی حاصل رہی، لیکن ذہنی و عقلی آزادی بجائے خود ایسی زبردست لذت ہے کہ ایک بار چکھ لینے کے بعد اس کا چھوڑنا محال ہے، اس لئے اس کا ذوق رفتہ رفتہ عام ہوتا گیا اور ذہن و خیال کی دنیا ہی بالکل بدل گئی۔

چنانچہ اب انسان اس جسم متحرک کا نام نہیں ہے جو ایک وقت معین تک حرکت کرتے رہنے کے بعد فنا ہو جاتا ہے، بلکہ انسان نام ہے قوائے عقل و دماغ کی ترقی کا، حرکت و عمل کا، تحقیق و جستجو کا، اعتماد ذاتی کا اور آسمان سے لیکر زمین تک تمام مناظر قدرت پر چھا کر رہ جانے کا۔ اب وہ اس کا قایل نہیں ہے کہ طاعت و عبادت بجائے خود کوئی تقدس و پاکیزگی ہے اور انعام خداوندی کی مستحق، اب وہ یہ ماننے کے لئے طیار نہیں کہ جزا و سزا اور مافوق الفطرت قوت سے متعلق ہے بلکہ وہ تقدس کا مفہوم صرف حرکت و عمل کو قرار دیتا ہے

اور یقین کرتا ہے کہ انسان کی دوزخ وجنت خود اسی کے اندر اور اسی دنیا میں موجود ہے، اور اسے اختیار حاصل ہے خواہ وہ جہول وبیکار زندگی بسر کرکے جہنم میں چلا جائے خواہ سعی ومحنت سے کام لیکر فردوس حاصل کرے۔

یہ اعتقاد کہ بادشاہ کو خدا، بادشاہ بنا کر بھیجتا ہے اور رعایا کا کام صرف اس کی اطاعت ہے، اب ختم ہوگیا یہ عقیدہ کہ مذہب خدا کی بنائی ہوئی چیز ہے اور اس کے بتائے ہوئے اُصول وعقاید کو بغیر چون وچرا تسلیم کرنا ہمارا فرض ہے، بہت کچھ مٹ گیا ہے، خدا کے بھیجے ہوئے بادشاہ بھی رفتہ رفتہ فنا ہو رہے ہیں اور مذہبی حکومتیں بھی محو ہوتی جارہی ہیں۔

انگلستان میں بجائے خدا کے اب پارلیمنٹ کی حکومت ہے اور امریکہ میں مذہبی اقتدار کی جگہ رائے عامہ نے لیلی ہے، فرانس اپنی آبادی کے سوا کسی اور مافوق الفطرت قوت کو حکومت میں دخل دینے کا مستحق قرار نہیں دیتا اور روس میں سب سے بڑا جرم خدا اور مذہب کا نام لینا ہے۔ یوروپ میں صرف ایک قیصر ولیم (شاہ جرمنی) ایسا بادشاہ تھا جو اپنے آپ کو فرستادہ خدا سمجھتا تھا سو گزشتہ جنگ میں وہ بھی ختم ہوگیا۔

انسان آزادی کامل کی اس منزل تک سخت صعوبتیں اُٹھانے کے بعد پہونچا ہے اور استعمال عقل کے استحقاق کو اب اس سے کوئی نہیں چھین سکتا، جسوقت تک وہ اپنی فہم وفراست کو مشعل راہ بنانے سے باز رکھا گیا، بیشک وہ کہہ سکتا تھا کہ اصل نیکی صرف خوف جہنم سے کانپتے رہنا ہے اور حصولِ نجات کے لئے یہی کافی ہے، لیکن جب اس نے دیکھا کہ تنہا یہ عقیدہ نہ اس کے لئے روزی فراہم کرسکتا ہے نہ تن پوشی کے لئے لباس تو اس کی نگاہیں آسمان کی طرف سے زمین کی جانب مایل ہوئیں اور وہ یہ دیکھ کر متعجب ہوا کہ جو لوگ اپنے آپ کو مذہب کا پابند کہتے ہیں وہ بھی اسی کی طرح جُرم ومعصیت کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ سقراط کو جس نے زہر کا پیالہ دیا وہ بھی مذہبی انسان تھا، اور عیسیٰ کو جنھوں نے سولی پر چڑھایا وہ بھی خدا ہی کے ماننے والے تھے اس لئے اس کی روح میں بغاوت پیدا ہوئی اور اس طرح سب سے پہلا جذبۂ انتقاد جو مذہب کے خلاف رونما ہوا وہ خود اہل مذہب ہی کا پیدا کیا ہوا تھا۔

آپ کسی مذہب والے سے دریافت کیجئے وہ سوائے اپنے تمام دنیا کو گمراہ بتائے گا اور اسی خدا کو قابل پرستش قرار دیگا جو اس نے وضع کیا ہے، دوسرے مذاہب واقوام کے خداؤں کو وہ جھوٹا بتائے گا۔ وہ سوائے اپنے معبد کے کسی اور کی پرستش گاہ کی عزت نہ کرے گا، سوائے اپنے طریقِ

عبادت کے وہ کسی اور اصولِ بندگی کا احترام نہ کرے گا، وہ اپنی قربانیوں کے مقابلہ میں دوسرے مذہب کی قربانیوں کو لغو و بیکار بتائے گا۔ گویا اسی کا خدا خدا ہے اور اسی کا پیغمبر پیغمبر، اسی کی کتاب الہامی صحیفہ ہے اور اسی کی دعائیں مقبول۔

اب خدا کے اس تصور کو دیکھئے جو الہامی مذاہب نے پیش کیا ہے۔ خدا کو قادرِ مطلق، بے نیاز اور کسی چیز سے متاثر نہ ہو سکنے والا بتایا جاتا ہے لیکن اسی کے ساتھ کتب مقدسہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو غصہ بھی آتا ہے، وہ انتقام بھی لیتا ہے اور اپنے بندوں میں سے ایک کے ساتھ رعایت اور دوسرے کے ساتھ ظلم بھی کر سکتا ہے۔

عدن میں آدم و حوا کو خود ہی پیدا کرتا ہے اور نافرمانی و سرکشی نہیں بلکہ معمولی سی غلطی پر خود ہی اتنا برہم ہو جاتا ہے کہ عدن سے انھیں اٹھا کر زمین پر پھینک دیتا ہے اور نہ صرف ان کے لئے بلکہ ان کی اولاد کے لئے بھی تمام عمر غم و غصہ میں مبتلا رہنا مقسوم کر دیتا ہے ـــــ خدا اور اتنا غصہ! خالق اور اپنی مخلوق پر اتنی برہمی! اگر وہ جانتا تھا کہ ان سے یہ غلطی ضرور ہوگی تو پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی اور اگر پیدا کیا تھا تو کیا اس کے اختیار میں نہ تھا کہ وہ غلطی نہ کر سکنے والی مخلوق پیدا کرتا۔ خود ہی ان کو پیدا کیا، خود ہی ان میں لغزش کی کیفیت پیدا کی اور خود ہی برہم ہو کر انھیں مبتلائے آلام کر دیا، عجیب تماشہ ہے۔

الہامی صحائف خدا کے غصے اور جنگ و قتال کے احکام سے بھرے پڑے ہیں۔ قوموں کو اس نے برباد کیا، بستیوں کو اس نے ویران کیا، وبائیں اس نے مسلط کیں، آسمانی عذاب اس نے نازل کئے، حالانکہ انسان کی سرکشی یا نافرمانی بھی اسی کی پیدا کی ہوئی چیز تھی اور خود اسی کی مرضی تھی کہ وہ ایسا کرے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب انسانوں کو (جن میں عورتیں اور معصوم بچے بھی شامل تھے)، تباہ کرنا ہی مقصود تھا تو ان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی اور پیدا کیا تھا تو کیا اس کے اختیار میں نہ تھا کہ انھیں معصوم پیدا کرتا۔

ایک بار وہ ساری دنیا کو سوائے آٹھ آدمیوں کے طوفان میں غرق کر دیتا ہے اور تمام زمین کو لاشوں سے پاٹ دیتا ہے، اس کے بعد وہ صرف یہودیوں کو لطف و کرم کا مستحق سمجھتا ہے اور باقی تمام مخلوق کو بغیر کسی سبب کے مردود قرار دیتا ہے۔ نہ وہ اہل مصر کی طرف متوجہ ہوتا ہے نہ اہل ایران کی طرف، نہ اسیریوں کو قابل اعتنا خیال کرتا ہے نہ یونانیوں کو (حالانکہ ان سب کا خالق بھی وہی تھا) اور صدیوں تک صرف ایک فرقہ کا خدا بنا رہتا ہے۔ کیوں؟

خدا ایک قوم کو حکم دیتا ہے کہ وہ دوسری قوم سے جنگ کر کے ان کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو ہلاک کرے اور جو زندہ ہاتھ آجائیں انھیں لونڈی غلام بنائے۔ اس کے علاوہ وہ ادارۂ غلامی قائم

رکھنے کے لئے ان کی خرید و فروخت کی بھی اجازت دیتا ہے، بادشاہوں کے جرائم کے عوض میں رعایا کو ہلاک کرنا مناسب سمجھتا ہے، اور وہ بغیر کسی وجہ کے اپنے بندوں میں سے کسی ایک جماعت سے خوش ہو جاتا ہے اور دوسری سے برہم۔ اس کا سبب ؟

حقایق عالم کے لحاظ سے صحف مقدسہ نے جو معلومات انسان کے سامنے پیش کی ہیں، ان کا تو خیر ذکر ہی فضول ہے۔ زمین کا چپٹا و مسطح بتانا، طبقات الارض کا انتہائی درس ہے اور تاروں کو آسمان میں جڑا ہوا ظاہر کرنا فلکیات کا بلند ترین نظریہ۔

صحت و امراض کے متعلق دو نظرئے دنیا میں رائج ہیں، ایک مذہبی، دوسرا علمی، مذہبی نظریہ یہ ہے کہ بیماریاں ارواحِ خبیثہ سے پیدا ہوتی ہیں جو جسم انسانی میں حلول کر جاتی ہیں اور ان ارواحِ خبیثہ کو مذہب کے نفوس مقدسہ ہی دور کر سکتے ہیں۔

جب تک مسیح زندہ رہے ان کی عمر شیاطین و ارواح خبیثہ کے دور کرنے میں بسر ہوئی اور بعد کو ان کے مقدس راہبوں نے صدیوں تک یہ خدمت انجام دی، چنانچہ ازمنۂ وسطیٰ میں لاکھوں کروروں شیاطین اسی طرح بھگائے جاتے رہے اور امراض کا علاج جھاڑ پھونک، دعا تعویذ اور گنڈوں سے ہوتا رہا۔ امراض کے طبیعی اسباب کا کوئی علم نہ تھا، مقدس اہل مذہب دعاؤں کے بہانہ سے ہزاروں روپیہ کماتے تھے (فقیروں کی روزی کا مدار اسی پر ہے)

آخر کار جب علم بڑھا تو آہستہ آہستہ امراض کے طبیعی اسباب کا بھی علم ہوا اور ان کے دور کرنے کی طبیعی تدابیر بھی رائج ہوئیں چنانچہ اسوقت سوائے جاہل ممالک کے جن میں ہندوستان کا مرتبہ سب سے بلند ہے، جنات و شیاطین یا ارواح خبیثہ کا عقیدہ بالکل اٹھ گیا ہے اور جب کوئی بیمار پڑتا ہے تو بجائے دعا تعویذ کے علاج کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔

مذاہب عالم اور کتب مقدسہ کے متعلق بھی دو خیال ہیں۔ ایک جماعت (اہل مذہب کی) کہتی ہے کہ وہ بالکل الہامی ہیں اور انسانی فکر کو ان میں دخل نہیں، اور دوسری جماعت کہتی ہے کہ صحف مقدسہ سب انسانوں سے دماغ کا نتیجہ ہیں، اور مذہب رونما ہوا ہے صرف اس جذبۂ خوف سے جو حوادث طبیعی و مظاہر قدرت کو دیکھ دیکھ کر انسان کے دل میں پیدا ہوتا تھا۔ چنانچہ دنیا میں کوئی قدیم قوم ایسی نہ تھی جس کا کوئی مذہب نہ رہا ہو اور طاعت و عبادت کو اس نے اپنی حفاظت و نجات کا ذریعہ خیال نہ کیا ہو، لیکن رفتہ رفتہ یہ واہمہ پرستی کم ہوتی گئی،

یہاں تک کہ اب ہر ذی فہم انسان جانتا ہے کہ دنیا میں ہر واقعہ کا ایک فطری سبب ہوا کرتا ہے اور قدرت بغیر اس خیال کے کہ انسان کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں اپنے کام میں مصروف ہے۔

اب مفکرین اچھی طرح واقف ہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب خود انسانوں نے وضع کئے تھے اور خداداد الہام خداوندی سے انہیں کوئی تعلق نہ تھا، جن کتابوں کو وہ الہامی کہتے ہیں وہ بھی انسان ہی کے دماغ کا نتیجہ تھیں اور اسی لئے ہر قوم و زمانہ کے لحاظ سے ان میں مختلف خیالات و تعلیمات پائی جاتی ہیں۔ نہ خدا کو طاعت و عبادت کی ضرورت ہے اور نہ وہ کسی کی دعا سنتا ہے، اہل دنیا پر ہزاروں مرتبہ قحط و وبا، طوفان و سیلاب کی مصیبتیں نازل ہوئیں اور کوئی دعا انہیں دور نہ کر سکی۔ زلزلے آتے رہے، جوالا مکھی آگ برساتے رہے، ہزاروں معصوم نفوس فنا ہوتے رہے اور انسان کی گریہ وزاری سے خدا کو اس ہلاکت خیزی سے باز نہ رکھ سکی، کھیتیاں سوکھتی رہیں اور انسانوں کی دعائیں ایک قطرہ پانی کا نہ حاصل کر سکیں، وبائیں پھیلتی رہیں اور خدا کے نام پر لکھے ہوئے تعویذ کسی ایک متنفس کو بھی ہلاکت سے نہ بچا سکے، ظالموں کی تلواروں سے اہل ایمان کٹتے رہے، عورتوں کی عصمت دری کو علی الاعلان جائز رکھا گیا، شیر خوار بچے ماؤں کی آغوش سے چھین چھین کر بازاروں میں فروخت کئے گئے، اور ان کی فریاد وزاری ایک لمحہ کے لئے خدا کو متوجہ نہ کر سکی کہ وہ ظالم بادشاہوں کی حکومت کے بجائے آسمانی بادشاہت قائم کرتا۔

اخلاقیات کے باب میں اہل مذہب کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا نے جس فعل سے باز رکھا ہے وہی برا ہے اور جس کے کرنے کا حکم دیا ہے وہ اچھا ہے، خود بندہ کو اس کا کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ خود کسی فعل کے مستحسن یا قبیح ہونے پر رائے زنی کرے، گویا مذہبی انسان کسی اچھے کام کو خود اچھا سمجھ کر انجام نہیں دیتا بلکہ فرمان خداوندی کی تعمیل سمجھ کر اس کو اختیار کرتا اور صرف اس خوف سے کہ مبادا خدا برہم ہو جائے اور اسے عذاب میں مبتلا کرے۔

تقریباً تمام اہل مذہب کا عقیدہ ہے کہ ایک انسان اچھے اخلاق کا حامل نہیں ہو سکتا جب تک وہ وجود خدا کا قائل نہ ہو اور اگر کسی میں یہ صفت پائی بھی جائے تو بغیر خدا کو مانے ہوئے وہ بالکل بیکار ہے۔

علماء اخلاقیات کا نظریہ یہ ہے کہ نیکی و بدی اشیاء کی فطرت میں موجود ہے۔ بعض افعال ایسے ہیں جو انسانی مسرت کا باعث ہوتے ہیں اور بعض آزار و مصائب کا سبب بن جاتے ہیں، چنانچہ اول الذکر افعال کو ہم اخلاق حسنہ کہتے ہیں اور موخر الذکر کو افعال قبیحہ یا معصیت سے تعبیر کرتے ہیں۔

اخلاق انسانی کا تعلق اسی دنیا سے ہے اور یہیں ان کے نتائج دیکھ کر ان کے برے یا اچھے ہونے کا اصول قائم کیا گیا ہے، نہ خدا ان سے متاثر ہوتا ہے اور نہ دوسری دنیا میں ان کا محاسبہ کر کے جزا و سزا دینے کی ضرورت

چوری کو برا سمجھنے کے لئے کسی الہام کی ضرورت نہ تھی، انسان کے تجربے نے اس کے نقصانات دیکھ کر خود اسے برا قرار دیا۔ تمام وہ جرائم جو انسان کو جسمانی، اقتصادی و عمرانی نقصان پہونچاتے ہیں، ان سے اپنے آپ کو محفوظ رہنے کا احساس ہر شخص میں فطری طور پر پایا جاتا ہے اور یہی وہ احساس تھا جس نے اسے بتایا کہ نیکی کسے کہتے ہیں اور بدی کس کو۔

پھر جو چیز اس لحاظ سے بری ہے وہ یقیناً بری سمجھی جائے گی خواہ مذہب کے نزدیک اچھی ہو۔ واقعات و اثرات کو کوئی قوت نہیں بدل سکتی، جس طرح قدرت ایک مربع کو دایرہ ثابت کرنے سے عاجز ہے اسی طرح وہ کسی بری بات کو اچھی اور اچھی کو بری نہیں بنا سکتی۔

الغرض اہل مذہب نے جو نظریۂ اخلاق قایم کیا ہے اس پر ایک انسان کبھی فخر نہیں کر سکتا، ایک شخص نیک کام کرتا ہے صرف اس ڈر سے کہ خدا کا حکم ہے اور اس طمع سے کہ اس کا انعام دوسری دنیا میں ملیگا، دوسرا اچھے اخلاق اختیار کرتا ہے صرف اس بناء پر کہ یہ اس کا انسانی فرض ہے اور نیکی آپ اپنی جزا ہے اور دونوں کے فرق کو ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔

الغرض اسوقت دو راستے ہمارے سامنے ہیں۔ ایک وہ جو مذہب کی طرف ہم کو لیجاتا ہے اور دوسرا وہ جو عقل کی طرف رہبری کرتا ہے۔ سو اول الذکر کا تجربہ بہت کافی ہو چکا ہے اور ہمیشہ اس کا نتیجہ ایک ہی نکلا ہے۔

فلسطین میں اس کا تجربہ کیا گیا لیکن اہل فلسطین کی مذہبیت ان کو تباہ و برباد ہونے سے نہ بچا سکی، وہ مفتوح و مغلوب ہو کر خارج البلد کئے گئے۔ صدیوں تک امداد خداوندی کا انتظار کرتے رہے اور اس توقع پر زندہ رہے کہ خدا انھیں پھر مجتمع کرے گا، ان کی بستیوں، ان کے معبدوں اور قربانگاہوں کو از سر نو تعمیر کرے گا، لیکن صدیوں پر صدیاں گزرتی گئیں اور ان کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی۔

اس کا تجربہ سوئٹزرلینڈ میں کیا گیا لیکن وہاں بھی سوائے غلامی کے اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا، ترقی کی تمام راہیں مسدود کر دی گئیں، اور صرف انھیں لوگوں کو آزادی سے بولنے کا حق حاصل رہا جو صاحب جاہ و ثروت تھے۔ عوام سے ان کی معصوم مسرتیں چھین لی گئیں، ان کے لئے ہنسنا ممنوع قرار پایا، اور سوائے رنج غلامی کے کچھ نہ ملا۔ ان لوگوں نے اوراد و وظایف، روزہ و صلوٰۃ، وعظ و پند سبھی کو آزما کر دیکھ لیا لیکن کوئی چیز انھیں مسرت و راحت سے آشنا نہ کر سکی۔

اسکاٹ لینڈ میں بھی مذہب کا تجربہ ہوا اور نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کی ماننے والی تمام آبادی کو خوش قسمت

لیکن ظالم گرگوں کا غلام بنکر رہنا پڑا۔ پادری ہر خاندان میں گھس جاتے تھے اور خوف و واہمہ پرستی پھیلا پھیلا کر لوگوں کی عقلیں سلب کر رہے تھے، وہ اپنی ہدایات کو الہام ربانی کہتے تھے اور ان سے انحراف کرنے والے کو عذاب خداوندی کا مستوجب قرار دیتے تھے۔ پھر اس مذہبی حکومت میں بھی وہی ہوا جو ہونا چاہئے۔ انسان غلام تھا اور غلامی کے ناقابل برداشت بار سے اس کی پیٹھ جھکی جا رہی تھی۔

انگلستان میں مذہبی حکومت نے جو گل کھلائے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ اس زمانہ کے قانون اس زمانہ کے اوہام و تعصبات اس قدر سخت تھے کہ خدا کی پناہ۔ پادری خدا کے بیٹے بنے ہوئے آسمان و زمین کی ملکیت کا دعوی کر رہے تھے، بہشت و دوزخ کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں تھیں اور جس کو جہاں جی چاہتا تھا ڈھکیل دیتے تھے، نہ ان کے دلوں میں رحم تھا، نہ آنکھوں میں مروت، ادنی ادنی سی غلطیوں پر خارج البلد کر دینا، کوڑے لگوانا اور قید و بند میں ڈالدینا معمولی بات تھی۔

ازمنۂ مظلمہ میں مذہبی زندگی کا جو نتیجہ ہوا وہ اور زیادہ ہادم انسانیت تھا۔ ہزاروں سولیاں ہر وقت خون سے تر رہتی تھیں اور بیشمار تلواریں انسانی سینے میں پیوست۔ قید خانے کھچا کھچ بھرے رہتے تھے اور سیکڑوں انسان دہکتی ہوئی آگ کے اندر پڑے ہوئے تڑپا کرتے تھے۔ کوئی ظلم ایسا نہ تھا جو خدا کے نام پر روا نہ رکھا گیا ہو اور کوئی معصیت ایسی نہ تھی جس کا ارتکاب مذہب کے پردہ میں نہ ہوتا ہو۔ الغرض یہ تھا مذہبی حکومتوں کا رنگ، جو اہل مذہب نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

اب اس کے مقابلہ میں اُس راستہ کو دیکھو جس کی رہنمائی عقل نے کی ہے۔ کیا صاف و ہموار راستہ ہے۔ کیسی کھلی ہوئی فضا ہے، کیسی پر بہار زمین ہے، ہر شخص دوسرے کا بوجھ ہلکا کرنے کی فکر میں ہے اور ہر دماغ اسی فکر میں ہے، کہ وہ بنی نوع انسان کی راحت و مسرت کا سامان بہم پہونچائے۔ نہ وہاں سولیاں ہیں، نہ قید خانے، نہ جہنم کے اژدہے ہیں، نہ فرشتوں کے کوڑے۔ قدرت کی وسیع فضا ہے جس سے ہر شخص یکساں فایدہ اُٹھا رہا ہے، عقل و فراست کا ایک آفتاب ہے جو سب کو برابر مستفیض کرنا چاہتا ہے، انسانیت کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں، غلامی کا داغ اشرف المخلوقات کی پیشانی سے مٹ چکا ہے، ذہنی آزادی نے مختلف قسم کے چمن کھلا رکھے ہیں اور ہر فرد دوسرے سے ہم آغوش و بغلگیر نظر آتا ہے۔

جس وقت میں تاریک ماضی کی طرف دیکھتا ہوں تو میرا ریشہ ریشہ کانپ اُٹھتا ہے۔ سب سے پہلے مجھے وہ تنگ و تاریک غار نظر آتے ہیں جہاں مقدس اژدہے کنڈلیاں مارے ہوئے قربانیوں کا انتظار کر رہے ہیں ان کے جبڑے کھلے ہوئے ہیں، ان کی زبانیں باہر نکلی ہوئی ہیں آنکھیں چمک رہی ہیں اور زہریلے دانت خون آلود۔ جاہل ماں باپ اپنے معصوم بچوں کو اس افعی دیوتا کے حضور میں پیش کرتے ہیں، وہ اس

چیختے تڑپتے ہوئے بچہ کو اپنے بل میں لپیٹ کر پیٹ میں ڈالتا ہے اور بے رحم والدین اس ہدیہ کے قبول ہونے پر خوش خوش واپس جاتے ہیں --- اس کے بعد مجھے وہ عبادتگاہیں نظر آتی ہیں جن کو بڑے بڑے پتھروں سے طیار کیا گیا ہے لیکن یہاں ان کی قربانگاہیں بھی خون سے رنگین ہیں اور مقدس پجاریوں کے خنجر معصوم لڑکوں کے سینوں میں یہاں بھی پیوست نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ اور معبد سامنے آتے ہیں جہاں مقدس آگ کی روشنی کو انسانی گوشت و خون سے قایم رکھا جاتا ہے۔ پھر چند عبادتگاہیں اور دکھائی دیتی ہیں جن کی قربانگاہیں بیلوں اور بکریوں کے خون سے تر ہیں --- اس کے بعد ہی سینکڑوں اور معبد، کچھ اور پجاری کچھ اور قربانگاہیں نظر آتی ہیں جہاں انسانی آزادی کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے۔ خدا کے معبد تو نہایت عظیم الشان ہیں لیکن کسانوں کے پاس جھونپڑا تک نہیں، پجاریوں اور بادشاہوں کے جسم زرکار عباؤں سے آراستہ ہیں لیکن رعایا کے پاس جسم ڈھانکنے کو بوسیدہ سا چیتھڑا بھی نہیں --- اور کیا دیکھتا ہوں --- یہ کہ قیدخانے انسانوں سے بھرے ہوئے ہیں، خارج البلد خاندان برباد ہو رہے ہیں، بچے اور عورتیں پہاڑوں اور صحراؤں میں سر ٹکرا رہی ہیں۔ آلات تعذیب حرکت میں آ رہے ہیں اور لاکھوں انسانوں کی چیخ سے خانقاہیں گونج رہی ہیں --- اُف وہ تاریک قیدخانے، وہ زنجیروں کی جھنکار، وہ آگ کے بلند شعلے، وہ جھلسے ہوئے سیاہ چہرے، وہ اینٹھنے والے اعضاء وہ شکنجوں میں کسے ہوئے ہزاروں معصوم انسان اور وہ ان کے رگوں کے ٹوٹنے کی آوازیں --- اس کے بعد جو میری نگاہ اٹھتی ہے تو افق پر مجھے ایک نئی روشنی نظر آتی ہے، انسانی جسموں کی راکھ کے ڈھیر سے ایک نیا آفتاب طلوع کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے یعنی عقل و مذہب آزادی و غلامی کی جنگ جاری ہے اور آہستہ آہستہ زنجیریں ٹوٹتی جا رہی ہیں، قربانگاہیں فنا ہوتی جاتی ہیں، عبادتگاہیں مسمار ہو رہی ہیں، زبان کی بندشیں اٹھتی جاتی ہیں، اور ذہن و عقل کے قفل ٹوٹتے جا رہے ہیں --- اب میں پھر دیکھتا ہوں لیکن ماضی کی طرف نہیں بلکہ مستقبل کی طرف اور فرط مسرت سے اچھل پڑتا ہوں کہ اس وقت مجھے کیا نظر آتا ہے --- یہ کہ:--- پجاری اور بادشاہ ختم ہو چکے ہیں، قربانگاہیں اور تخت و تاج خاک میں مل چکے ہیں، عمارتیں نیست و نابود ہو چکی ہیں اور تمام دیوتا مفقود --- ان کی جگہ ایک نیا مذہب رونما ہوا ہے جس کا نام آزادی ضمیر ہے اور ایک نئی سلطنت قایم ہوئی ہے جس کی ملکہ حریت فکر و رائے اور جس کی رعایا اخوت عامہ ہے، ہر جگہ امن و سکون ہے اور ہر شخص مطمئن، نہ کوئی قیدخانہ ہے، نہ بیمارستان، نہ عدالت گاہیں ہیں نہ جرم و معاصی کی داستان، ایک ایسی دنیا ہے جہاں سوائے صداقت کے کسی چیز کا گذر نہیں، سوائے حسن و جمال کے کوئی شے پیش نظر نہیں --- جدھر دیکھو نور کی بارش ہے اور انسانی دماغ کی کھیتیاں لہلہا رہی ہیں۔ عقبیٰ کا خوف دنیا کی مسرتوں میں تبدیل ہو چکا ہے اور خدا کا ڈر انسانیت کی تعمیر میں ---

دوافروش کی بیوی

بی ـــ کا مختصر سا قصبہ جو دو یا تین پیچیدہ سڑکوں پر مشتمل تھا گہری نیند سو رہا تھا۔ ہوا بالکل ساکت تھی کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ لیکن شہر سے دور، بہت دور، البتہ، کتوں کے بھونکنے کی مبہم مگر خوفناک آواز آرہی تھی۔ پو پھٹنے کے قریب تھی۔

ساری دُنیا غافل سو رہی تھی۔ وہ تنہا ہستی جو اب تک بیدار تھی، ڈاکٹر ملگر نویٹک کی بیوی تھی جس نے بی۔ میں دوافروشی کی دوکان کھول رکھی تھی، وہ بستر پر سو جانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی اور تین دفعہ کچھ دیر سو کر بیدار ہو گئی تھی۔ وہ حیران تھی کہ آخر اس بے خوابی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ مگر کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ وہ شب خوابی کے کپڑے پہنے کھڑکی سے سڑک کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کی روح مضمحل، افسردہ، اور غمگین تھی، اتنی مغموم کہ اُس کا دل بے اختیار چیخ اُٹھنے کو چاہتا تھا۔ اور اب بھی وہ اس اضمحلال کا سبب سمجھنے سے قاصر تھی۔ اُس کے دل پر ایک بوجھ سا معلوم ہوتا تھا جو بتدریج حلق کی جانب بڑھ رہا تھا..... اور اُس کے پیچھے کی جانب کچھ ہی فاصلہ پر ملگر نویٹک دیوار کے قریب پاؤں پھیلائے خراٹے لے رہا تھا۔ ایک لالچی پسو اس کی ناک کی نوک پر نیش زنی کر رہا تھا مگر اُسے حس تک نہ تھی۔ وہ خواب کی حالت میں بھی مسکرا رہا تھا۔ شاید وہ اسوقت یہ خواب دیکھ رہا ہو کہ شہر کے ہر فرد کو کھانسی ہو گئی ہے اور ہر شخص اُسکی دوکان سے "شاہ ڈنمارک کی کھانسی کے قطرے" خرید رہا ہے۔ وہ اب کسی تجویز سے بھی جاگ نہیں سکتا تھا۔

دوافروش کی دوکان، شہر کے انتہائی سرے پر واقع تھی، اس لئے دوافروش کی بیوی کھیتوں کی طرف دور دور تک دیکھ سکتی تھی۔

یکایک، رات کی خاموشی میں قدموں کی چاپ اور آہستہ آہستہ بات کرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ آواز قریب تر ہوتی گئی۔ ـــ "یقینی، یہ افسران ہیں جو اپنے گھروں سے خیمے کی طرف جا رہے ہیں" دوافروش کی بیوی نے دل میں سوچا۔

اس کے بعد دو شکلیں، افسروں کی سفید وردی میں ملبوس نظر پڑیں۔ ایک دراز قد اور فربہ، دوسرا نحیف اور پستہ قد۔ قدم اُٹھاتے اور بلند آواز سے گفتگو کرتے ہوئے وہ دوکان کی سمت چل پڑے۔ جب وہ دوا فروش کی دوکان کے قریب پہونچے تو انھوں نے اپنی چال بالکل آہستہ کر دی اور کھڑکی کی جانب دیکھنے لگے۔

"معلوم ہوتا ہے یہاں پر دوا فروش کی دوکان ہے" نحیف شخص نے کہا۔

"اور یہ بالکل صحیح ہے!" "آہ مجھے یاد ہے میں گزشتہ ہفتہ یہاں ایک دوا لینے آیا تھا۔ یہاں ایک ژولیدہ مُو اور بھدے جسم کا دوا فروش رہتا ہے"

"ہاں، درست!" دراز قد نے ہلکی آواز میں کہا۔ دوا فروش سو رہا ہے اور اسکی بیوی بھی سو رہی ہوگی۔ او بیٹکو، وہ بڑے دلکش خد و خال کی عورت ہے"

"میں نے اُسے دیکھا ہے۔ وہ بیحد حسین ہے۔ ڈاکٹر مجھے بتاؤ کیا وہ اُس گدھے سے محبت کر سکتی ہے؟"

"نہیں، یقیناً وہ اس سے محبت نہ کرتی ہوگی" ڈاکٹر نے یہ کہکر اس طرح سانس لی جیسے اُسے دوا فروش سے بیحد ہمدردی ہو۔ "کھڑکی کے قریب وہ نازک اندام حسینہ، خوابِ نوشیں کے مزے لے رہی ہوگی۔ کیوں؟ اس کا تنہا سادہانہ کھلا ہوگا۔ اور ایک نازک پاؤں پلنگ کے نیچے پڑا ہوگا مجھے دعویٰ ہے کہ وہ بے وقوف دوا فروش اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ وہ کس درجہ خوش نصیب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک حسین عورت اور ایک بوتل تیزاب میں اُسے کوئی امتیاز نہیں"

"میں کہتا ہوں ڈاکٹر" افسر نے رکتے ہوئے کہا۔ "ہم دوکان میں چل کر کوئی چیز خریدیں۔ شاید اسی بہانہ سے ہم اُسے دیکھ سکیں"

"کیا بات کہی ہے ——— شب میں؟"

"اس سے کیا ہوتا ہے چلو اندر چلیں"

"جیسی تمہاری مرضی"

دوا فروش کی بیوی نے پردے کی اوٹ سے گھنٹی کی آواز سُنی۔ شوہر کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے، جو پہلے کی طرح مسکرا رہا تھا اور خراٹے لے رہا تھا، اُس نے اپنا لباس پہنا، اپنے ننگے پیروں کو جوتوں میں چھپایا، اور دوکان کی طرف بھاگی۔ شیشے کے دروازے کی دوسری جانب اُسے دو سائے نظر پڑے۔ اُس نے جلدی سے روشنی کی اور دروازہ کھولنے کے لئے آگے بڑھی، اور اب...... نہ وہ افسردہ تھی

نہ غمگین اور نہ اب اس کا جی چلانے کو چاہتا تھا، مگر دل ضرور دھڑک رہا تھا۔ دراز قد ڈاکٹر اور پستہ قد اوبسٹکو اندر داخل ہوئے۔ اب وہ انھیں بجلی کی روشنی میں صاف دیکھ سکتی تھی۔ ڈاکٹر، توانا تنومند اور قوی الجثہ تھا۔ اس کے داڑھی تھی اور وہ آہستہ رو تھا۔ ذری سی جنبش میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی پتلون پھٹ جائے گی اور اس کی پیشانی پر پسینہ آجاتا تھا۔ افسر، سُرخ رُو، داڑھی منڈا، نازک اور انگریزی بید کی طرح لچیلا تھا۔

"میں آپ کو کیا پیش کروں" دوا فروش کی بیوی نے اپنے سینے پر پڑے ہوئے لباس کو درست کرتے ہوئے پوچھا۔

"دیدیجئے ... ار ... ار ... چار پنس کی پیپر منٹ کی گولیاں"

تیزی سے دوا فروش کی بیوی نے طاق سے بکس اُتارا اور گولیاں تولنے لگی۔ ڈاکٹر نے ایک آسودہ بلی کی طرح اس پر سے نظریں ہٹالیں لیکن اس کے برعکس، لفٹنٹ اُسے برابر خاموشی سے دیکھتا رہا۔

"یہ پہلا موقعہ ہے کہ میں نے ایک خاتون کو ایک دوا فروش کی دوکان میں کام کرتے دیکھا ہے" ڈاکٹر نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے" دوا فروش کی بیوی نے سُرخ رو افسر کی طرف گوشۂ چشم سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرے شوہر کا کوئی مددگار نہیں ہے اور میں ہمیشہ اس کا ہاتھ بٹاتی ہوں"

"بالکل صحیح۔ تمھاری چھوٹی سی دوکان نہایت عمدہ ہے! کتنی بوتلیں ہیں۔ اور تمھیں ان زہروں کے درمیان چلتے ڈر نہیں معلوم ہوتا؟ کمال ہے!"

دوا فروش کی بیوی نے پڑیا کو تہہ کیا اور ڈاکٹر کے حوالہ کی۔ اوبسٹکو نے قیمت ادا کی۔ آدھ منٹ تک خاموشی مسلط رہی۔۔ مردوں نے تبادلۂ نگاہ کیا، دروازے کی جانب ایک قدم بڑھایا، اور پھر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"براہ کرم کیا آپ دو پنس کا سوڈا بھی دے سکتی ہیں؟" ڈاکٹر بولا۔ پھر دوا فروش کی بیوی نے آہستگی اور خاموشی سے اپنا ہاتھ طاق کی طرف بڑھایا۔

"کیا آپ کی دوکان میں کوئی چیز مثلاً ..... " اوبسٹکو اپنی اُنگلی ہلاتے ہوئے بڑبڑایا۔ "کوئی چیز نشہ آور ..... فرحت بخش ..... ہے؟"

"ہاں!" دوا فروش کی بیوی بولی۔

"خوب! تم عورت نہیں چھلاوا ہو۔ تین بوتلیں لاؤ"

دوا فروش کی بیوی نے آہستہ سے سوٹے کی پڑیا کو تہ کیا اور دروازہ کی راہ سے تاریکی میں گم ہو گئی۔"
ایک منٹ بعد دوا فروش کی بیوی آئی اور اُس نے پانچ بوتلیں کھڑکی پر رکھدیں۔ اُسکے رُخسارے تمتمائے ہوئے اور سُرخ تھے۔

اوبسلکو بوتل کا کاگ کھول کر اُس کے ڈھکنے کو الگ رکھتے ہوئے بولا، "اتنا شور نہ کرو تمھارا میاں جاگ اُٹھے گا"

"تمھیں کیا، اگر میں اُسے بیدار کر دوں ؟"
"کیسی میٹھی نیند سو رہا ہے۔ وہ تمھارے خواب دیکھ رہا ہوگا تمھاری تندرستی کے!
ڈاکٹر ہنستے ہوئے پانی کا ایک گھونٹ لے کر بولا۔
"شوہر ایسی اچھی چیز ہوتے ہیں کہ وہ ہمیشہ سوتے رہیں تو اچھا"
"اس پانی میں گلابی شراب کا ایک قطرہ کیا لطف دے جاتا!"
"کیا بہتر خیال ہے" دوا فروش کی بیوی ہنسی۔
"بہت خوب ہوتا! کیا قہر ہے کہ دوا فروش شراب نہیں بیچتے۔ حالانکہ دوا کی طرح تمھیں شراب بھی فروخت کرنی چاہیئے۔ کیا تمھارے یہاں کوئی شراب ہے ؟"

"ہاں!"
"تو تھوڑی سی لاؤ۔ لاؤ! جلدی کرو!"
"تمھیں کتنی چاہیئے"
"ہمیں ایک اونس پانی میں ملا کر دو پھر دیکھا جائے گا"
ڈاکٹر اور اوبسلکو کھڑکی کے قریب اپنی ٹوپیاں اُتار کر بیٹھ گئے اور شراب کا دور چلنا شروع ہوا۔
شراب، ہر شخص تسلیم کرے گا، بہت بُری چیز ہے، گو اس کا مزہ انگور کی طرح ہوتا ہے۔
— "تم بڑی دلکش ہو تماترا! میں تصور میں تمھارے ہاتھ کا بوسہ لے رہا ہوں"
— میں اسے حقیقت میں منتقل کرنے کے لئے ایک بڑا سرمایہ خرچ کرنے کے لئے طیار ہوں بلکہ زندگی قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کروں گا"
"یہ بہت ہے!" بیگم ٹکرنوہٹیک نے لجاتے اور سنجیدہ صورت بناتے ہوئے کہا۔
"تم کیسی نادان ہو" ڈاکٹر اُس کے سراپا پر ایک نگاہ پسندیدگی ڈالتے ہوئے نرمی سے ہنسا
"تمھاری آنکھیں چنگاریاں برسا رہی ہیں! میں تمھیں مبارکباد دیتا ہوں کہ تُنے میری روح پر فتح حاصل کرلی

اور ہم مفتوح ہو گئے!"

دوا فروش کی بیوی نے اُن کے سرخ بھبھوکے چہرے کو دیکھا، ان کی گرمجوشی اور محبت بھری باتوں کو سنا، اور وہ بھی زندہ دلی اور نرمی سے بولنے لگی۔ وہ کتنی مسرور تھی! اس کی زندگی کی ابتدا دو ہی ساعت پہلے ہوئی تھی! ان کی باتوں میں وہ بھی دلچسپی لینے لگی، ہنسی، لجائی اور ان کے مکرر اصرار پر دو جام پی گئی آخر وہ بولی۔

"آپ حضرات میرے یہاں کبھی کبھی ضرور تشریف لایا کریں۔ میری زندگی اس جگہ بے حد سرد اور بے لطف گزرتی ہے۔ میں تو اس زندگی کے ہاتھوں ایک دن مر جاؤں گی!"

"میں آپ کی تجویز پر غور کروں گا" ڈاکٹر نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "فطرت کا شاہکار یوں بے وقعتی کے ہاتھوں تباہ ہو رہا ہے! اب ہمیں چلنا چاہیئے۔ آپ کی شناسائی سے مسرت ہوئی۔ ہمیں آپ کو کیا دام دینا ہے۔

دوا فروش کی بیوی نے اپنی بڑی بڑی نیلگوں آنکھیں چھت کی طرف اٹھائیں اور اس کے لب کچھ دیر جنبش میں رہے۔

"بارہ روبل اڑتالیس کوپک!" اس نے آہستہ سے کہا۔

اسٹکو نے اپنی موٹی تھیلی نکالی اور نوٹوں کو کچھ دیر گننے کے بعد رقم ادا کر دی۔

تمہارا شوہر میٹھی نیند سو رہا ہے۔ وہ خواب دیکھ رہا ہوگا!" وہ بڑبڑایا اور چلتے وقت اسکے ہاتھوں کو دبایا۔

"میں ایسی باتیں سننا پسند نہیں کرتی!"

"کونسی باتیں! اس کے برخلاف یہ کوئی بری بات نہیں۔ شکسپیر نے کہا ہے: "شاد ہے وہ جو اپنے عہد شباب میں بھی نوجوان ہے"

"میرا ہاتھ چھوڑئیے!"

آخر بہت دیر باتیں کرنے کے بعد اور خاتون کے ہاتھوں کا الوداعی بوسہ لیکر خریدار دوکان سے بلا ارادہ چل کھڑے ہوئے۔ گویا وہ حیران تھے کہ وہ کوئی چیز تو نہیں بھول آئے۔

وہ تیزی سے سونے کے کمرے کی طرف گئی اور اسی جگہ بیٹھ گئی۔ اُس نے ڈاکٹر اور افسر کو دوکان سے نکلنے کے بعد سست قدموں سے جاتے دیکھا۔ اس کے بعد وہ ٹھہر گئے اور سرگوشیاں کرنے لگے۔ لیکن کس چیز کے متعلق؟ اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کی پلکیں پھڑکنے لگیں لیکن کیوں؟ یہ اسے خبر نہ تھی۔ اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے ان کی سرگوشیاں اُس کی قسمت کا فیصلہ کر رہی ہوں

پانچ منٹ بعد، ڈاکٹر اسٹکو سے جدا ہو کر چلا گیا اور اسٹکو واپس لوٹا۔ وہ دوکان سے ہو کر ایکبار پھر گزرا۔

دروازے کے قریب رک جاتا اور پھر آگے کی طرف بڑھ جاتا۔ آخر، گھنٹی کی مدہم آواز سنائی دی "کیا ہے، ہاں، کون ہے؟" دوافروش کی بیوی نے دفعتاً اپنے شوہر کی آواز سنی۔ "دروازہ پر گھنٹی بج رہی ہے اور تمہیں خبر نہیں ہوتی" اس نے سختی سے کہا۔ "کیا اسی طرح کام چلتا ہے؟" وہ اٹھا اپنی پوشاک پہنی اور نیم بیداری کی حالت میں سلیپر پہن کر جھومتا ہوا دوکان کی طرف چلا۔ "کیا ہے؟" اس نے اسٹکو سے پوچھا۔

"دیدیجئے... دیدیجئے... چار پنس کی پیپرمنٹ کی گولیاں"

مسلسل خرخراتے، جمائی لیتے ہوئے، غنودگی کے عالم میں دوافروش طاق تک گیا اور ڈبہ اٹھایا۔

دو منٹ بعد، دوافروش کی بیوی نے اسٹکو کو دوکان سے باہر جاتے اور کچھ دور چل کر پیپرمنٹ کی پڑیا گردوغبار سے اٹی ہوئی سڑک پر پھینکتے دیکھا۔ ڈاکٹر تاریکی سے نکل کر اس سے ملنے آیا...... وہ ملے اور قہقہا لگاتے ہوئے صبح کے دھندلکے میں روپوش ہوگئے۔

"میں کس درجہ افسردہ ہوں" دوافروش کی بیوی اپنے شوہر کو غصہ سے دیکھکر بولی۔

"میں چار پنس کھڑکی پر بھول آیا ہوں" دوافروش چادر تانتے ہوئے بڑبڑایا۔ "اسے اٹھاکر صندوقچہ میں رکھ دینا" اور فوراً ہی پھر سوگیا۔

(روسی افسانہ) ابوالفتح سرمد

بہار

مولفہٗ الیاس احمد ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی منصف سہارنپور

گلدستۂ "بہار" فارسی اور اردو شعراء کے چوٹی کے کلام خصوصاً غزلوں کا بہترین اور نایاب مجموعہ ہے یا یوں سمجھئے کہ شعراء کی پاکیزہ زبان میں حسن و عشق کی مکمل داستان ہے۔ اس داستان کے آغاز عشق سے لیکر انجام عشق تک جتنے عنوانات قائم ہوسکتے ہیں، قائم کئے گئے ہیں اور ہر عنوان کے تحت میں چیدہ چیدہ اور متحدالمضامین اشعار درج ہیں عنوانات سیکڑوں ہیں۔ اس گلدستہ کے ہوتے ہوئے شاید ہی کسی کے دیوان کی ضرورت ہو۔ علم و ادب میں یہ گلدستہ ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے مصرعہ: شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں۔ قیمت معہ محصولڈاک ۸ ضخامت ۲۳۶ صفحات

ملنے کا پتہ:- مینجر صاحب۔ دارالمصنفین۔ اعظم گڈھ۔ یو۔ پی

ضیاء بدایونی اور مومن

(بسلسلۂ ماسبق)

ترے بال لاکر سونگھائے کہیں کہ غش ہو گئے چارہ فرمائے غش

شارح:۔ "شاید میرے غش کا علاج کرنے والوں نے علاج کی خاطر مجھے تیرے بال سونگھائے جنھیں وہ ان کی خوشبو سے بے ہوش ہو گئے۔"

صحیح ہے۔ مگر شعر میں دو نازک خیالیاں ہیں۔ ایک یہ کہ "غش ہو گئے" فریفتہ ہو گئے کے معنی میں مستعمل ہے اور دوسرے یہ کہ اغیار ہماری طرح نفیس طبع نازک دماغ نہ تھے لہذا انکو خوشبو سے غش آگیا۔ [1]

افلاس سے کھایا کئے غم سبز خطوں کا افسوس کہیں زہر بھی ہم کو نہ ملا قرض

شارح:۔ "سبز خطوں اور زہر (جس کے کھانے سے رنگ سبز ہو جاتا ہے) کی مناسبت ظاہر ہے۔ افلاس کی وجہ سے غم کھانے میں بھی لطافت ہے۔"

حسینوں نے افلاس کی بدولت منھ نہ لگایا۔ غم کھایا کئے۔ زہر بھی قرض نہ ملا کہ اسے کھا لیتے اور قصہ پاک ہو جاتا۔ [2]

تھا ربط غیر میں مرے مرنے کا انتظار اسے شوخ بیوفا تو وفادار ہے غلط

شارح:۔ "لوگ کہتے ہیں معشوق مومن کے ساتھ وفادار ہے۔ اس لئے کہ جب تک مومن نہ مرگیا۔ اس نے رقیب کے ساتھ ربط ضبط نہ رکھا۔ شاعر کہتا ہے یہ قول غلط ہے۔ اس لئے کہ وفاداری کا تقاضہ تو یہ تھا کہ وہ رقیب سے کبھی نہ ملتا۔"

---

[1] (نگار) ان دونوں نازک خیالیوں کے صرف کرنے کی ضرورت یہاں نہیں ہے۔ مومن نے لفظ "کہیں" یہاں "شاید" یا "ناگاہ" کے معنے میں استعمال کیا ہے۔

[2] (نگار) معلوم نہیں ہوتا کہ معترض کو اس شرح میں کیا اعتراض ہے علاوہ اس کے افلاس کی بدولت منھ نہ لگانے کا مفہوم پیدا کرنا بھی مومن کے مقصود کے خلاف ہے۔

لوگوں کے کہنے کا کوئی قرینہ شعر میں موجود نہیں ہے۔ خطاب محبوب سے ہے۔ بیوفائی کا ثبوت یہ ہے کہ وہ شاعر کے مرنے کے بعد اغیار سے ربط رکھتا ہے گویا اس کے لئے وہ اس کی مرگ کا منتظر تھا۔ غیر سے بھی بیوفائی اس لئے ثابت ہے کہ ربط میں تا حیات شاعر التوا رہا۔[۱]

ڈر مری آہ سے ظالم نہ بلا جی کہ نہیں — یہ جہنم سے تو کم شعلہ فشاں اے واعظ

شارح :۔ "تو جہنم سے ڈر کر میرا جی جلاتا ہے۔ مگر میری آہ سے نہیں ڈرتا یہ بھی جہنم سے کم نہیں"۔

میری رائے میں یہ شعر بلاغت کا بہترین نمونہ ہے۔ واعظ (اپنے زعم میں عشق کو ہوس کاری مانکر) جہنم کا خوف دلا کر عشق سے مانع ہے۔ یہ سنکر شاعر کا جی جلتا ہے اور اس کے منہ سے نکلتا ہے کہ جہنم سے زیادہ شعلہ فشاں آہ جو ہم نے قبول کر رکھی ہے۔ تو ایسا عشق ہوسناک کیونکر ہو سکتا ہے۔ پھر ہم کو جہنم کا ڈر کیا۔ "میری آہ سے ڈر" کا خطاب ظالم سے ہے یعنی اس آہ سے ڈرایا جاتا ہے جو مظلوم کے دل سے نکلے۔ اس شعر کے طرز ادا نے آہ کو بالفعل موجود ظاہر کیا ہے یعنی وہ آہ جو سوز عشق کا ماحصل ہے۔ موجود ہے۔ کہیں تیرے جی جلانے سے تجھ پر نہ پڑ جائے۔[۲]

محفل فروز تھی تب و تاب نہان شمع — پروانہ جل گیا کہ نہیں رازدان شمع

شارح :۔ "شمع کے سوز نہاں نے محفل کو روشن کر دیا۔ چونکہ پروانہ شمع کا رازداں نہ تھا۔ اس لئے جل گیا۔ ورنہ وہ بھی اس کی روشنی سے متمتع ہوتا"

پروانہ (آتش رشک سے) جل گیا کہ جلوۂ محبوب اغیار کے لئے کیوں وقف ہے۔ یوں کہیے کہ رازداں نہ ہونے کی سزا میں جلگیا کہ وہ شمع کو محفل فروز سمجھا۔ حالانکہ تب و تاب نہاں محفل فروز تھی۔ شمع، محبت کی آگ میں خود جل رہی تھی۔ محفل فروزی شمع کیا تھی عشق کا شعلۂ سرکش جو حسن کے پیرہن میں مخفی

---

[۱] (نگار) یقیناً شارح مفہوم کو پوری طرح ظاہر کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ لیکن معترض نے اپنے ایراد میں جو ٹکڑا غیر سے بیوفائی کا بڑھایا ہے وہ بھی درست نہیں ہے۔

[۲] (نگار) شارح اور مقالہ نگار دونوں نے مفہوم کے اظہار میں غلطی کی ہے اس شعر کا صاف مطلب یہ ہے کہ مومن واعظ سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ تو جو مجھے ترک محبت کی نصیحت کرتا ہے تو کیا تجھے میری آہ کا ڈر نہیں جو شعلہ فشانی میں جہنم کے برابر ہے۔ یعنی اگر اس تیری نصیحت پر ایک آہ بھی منہ سے نکل گئی تو جل کر خاک سیاہ ہو جائے گا۔

نہ رہ سکا اور اس صورت سے جلوہ گر ہوا [۵۱]

پروانے کیوں نہ صدقہ ہوں اس آگ کے کہ ہے ہر رشتۂ فتیلۂ زخمِ جگر چراغ

شارح :- "سوزشِ دروں کی وجہ سے میرے زخمِ جگر کی بتی کا ہر ڈورا چراغ کا حکم رکھتا ہے۔ پھر پروانہ اس پر کیوں نہ صدقہ ہوں۔ فتیلہ۔ بتی۔ یہاں وہ بتی جو زخم میں رکھی جائے مراد ہے۔"

یہاں اس قدر کہنا ضرور تھا کہ پروانہ سے کنایتاً عشاق مراد ہیں اور اس آگ سے مراد عشق ہے عشاق آتشِ عشق پر فریفتہ ہیں۔ مٹے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ زخمِ جگر کی ہر بتی کا رشتہ سوزِ دروں کی برکت سے چراغ کی طرح روشن ہوتا ہے [۵۲]

چھوڑا نہ لالہ زار میں ساتھ اُس نے غیر کا ہر چند سینہ چیر کے میں نے دکھائے داغ

شارح :- "وہ لالہ زار میں غیر کے ہمراہ مصروفِ گلگشت رہا۔ ہر چند میں نے سینہ چیر کے داغہائے رشک دکھائے۔ داغ اور لالہ زار کی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔"

یعنی غیر کے مقابل خود کو پیش کیا۔ اور لالہ زار کے مقابل داغہائے دل کو۔ اصل مراد داغِ عشق ہے۔ اور ضمناً داغِ رشک بھی اس میں شامل ہو جاتا ہے [۵۳]

مجلس میں تا نہ دیکھ سکوں یار کی طرف دیکھے ہے مجھ کو دیکھ کے اغیار کی طرف

شارح :- "معشوق پہلے اغیار کو دیکھ کر مجھ کو دیکھتا ہے۔ اور اس کا مقصد اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ میں رشک کی وجہ سے اس (معشوق) کی طرف دیکھنا چھوڑ دوں۔"

رشک مانعِ دید نہیں۔ ہاں اغیار کا متوجہ ہو جانا مانعِ دید ہو سکتا ہے [۵۴]

---

۵۱ (نگار) شارح کا بتایا ہوا مفہوم بالکل درست ہے۔ معترض اس شعر کو بالکل نہیں سمجھے۔

۵۲ (نگار) یہاں پروانے سے مراد پروانے ہی ہیں، عشاق نہیں۔ معترض کی تاویل نادرست ہے۔

۵۳ (نگار) اس میں بھی معترض نے خواہ مخواہ اپج کی لی ہے غیر کے مقابل خود کو پیش کرنے کا یہاں کوئی سوال نہیں ہے۔

۵۴ (نگار) شارح نے صحیح مفہوم ظاہر کیا ہے۔

شب ہجر و روز وصال کی تری شوخیاں جو نظر میں تھیں — کہوں کیا تغیر حال دل کبھی تھا سکوں کبھی تھا قلق

شارح :- "ہجر میں تیری شوخیاں جو نظر میں تھیں۔ اس لئے دل کو قلق ہوتا تھا۔ اور چونکہ وصال کی یاد دل میں تھی اس لئے سکون ہو جاتا تھا۔"

محض شوخی کی یاد سے قلق ہونا عجیب ہے اور وصال کی یاد سے سکون ہو جانا عجیب تر ہجر کی شب روز وصل کی شوخیاں (یعنی کبھی التفات کبھی ملال۔ کبھی بعد کبھی اتصال) میری نظر میں تھیں۔ اس لئے دل کا حال بھی متغیر تھا کبھی سکون تھا کبھی قلق۔ قلق ہجر ظاہر ہے۔ اور سکون کی وجہ یہ کہ خیال ہوتا تھا کہ ہجر ہجر نہیں ہے۔ یہ ایک عارضی شوخی ایسی ہی ہے، جس طرح وصل میں جدا ہو بیٹھتے تھے۔[1]

آفت جاں ہے کوئی پردہ نشیں — کہ مرے دل میں آ چھپا ہے عشق

شارح :- "میرے دل میں عشق چھپا ہے۔ یہ اس بات کی شہادت ہے۔ کہ کسی پردہ نشیں کی بدولت میری جان پر آفت آئی ہے۔"

پہلا مصرع ایک دعویٰ تھا۔ مولانا نے دوسرے مصرع کو دعویٰ قرار دیا۔ اور پھر دعویٰ کو بجائے خود جان پر آفت آنے کا ثبوت قرار دیا۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی پردہ نشیں آفت جاں ہے۔ اس لئے عشق میرے دل میں آ چھپا ہے۔[2]

دیکھ حالت مری کہیں کافر — نام دوزخ کا کیوں دھرا ہے عشق

شارح :- "کافر میری حالت دیکھ کر کہتے ہیں کہ یہ عشق نہیں عذاب دوزخ ہے یعنی دوزخ میں اتنا ہی عذاب ہے جتنا مومن کو عشق میں ہے۔"

کافر حشر و نشر جنت دوزخ کے منکر ہیں، علاوہ اس کے شعر کا انداز بیان بھی ایسا نہیں جس سے یہ مفہوم لیا جائے کہ کافر بھی دوزخ کے قائل ہو کر ایسا کہہ اُٹھے ہیں۔ مولانا نے "کہیں" کو فعل سمجھا مفہوم یہ ہے کہ :- او کافر (معشوق) کہیں میری حالت زار دیکھ۔ میری یہ حالت تو عذاب دوزخ ہے۔ اس کا نام عشق و عاشقی کیوں رکھا ہے۔[3]

---

[1] (نگار) دونوں نے غلطی کی ہے، شوخیوں کا تعلق صرف روز وصال سے ہے، شب ہجر سے نہیں۔ اس شعر میں لف و نشر غیر مرتب ہے اور صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہجر و وصال کی دو مختلف کیفیات (سکون و قلق کی) مجھ پر طاری تھیں۔

[2] (نگار) ایراد بالکل غلط ہے — [3] (نگار) معترض کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ کافر حشر و نشر، دوزخ و جنت کے قائل نہیں ہیں۔ تمام غیر مسلم اہل مذاہب اس چیز کے قائل ہیں۔ لیکن یہ بالکل درست ہے کہ شارح نے اس کا مفہوم غلط سمجھا۔ معترض نے جو مطلب بیان کیا ہے وہ درست ہے۔

جرم معلوم ہے زلیخا کا — طعنۂ دست نارسا کب تک

شارح :- ”زلیخا نے حضرت یوسف کے دامن پر ہاتھ بڑھایا۔ مگر رسائی میسر نہ ہوئی۔ شاعر کہتا ہے کہ تم جو زلیخا کا جرم جرم پکارتے ہو۔ ہمیں سب معلوم ہے۔ (یعنی کوئی جرم نہ تھا) اصل میں تم اس کو اسبات کا طعنہ دیتے ہو کہ اُس کا ہاتھ دامن یوسف تک رسا نہ ہو سکا۔“

زلیخا کا ہاتھ دامن یوسف تک رسا نہ ہونا صحیح نہیں ”قدت قمیصہ“ کی شہادت اس کے خلاف ہے یہ بھی خیال میں نہیں آتا کہ زلیخا کی وکالت حضرت مومن کیوں کرتے ہیں زلیخا کا جرم عشاق کی نظر میں جرم ہی نہ تھا، سو مومن کہتا ہے کہ تمھیں حقیقتاً زلیخا کو ادب عشق سے بیگانہ کہنا مقصود نہیں۔ بلکہ تم طنزاً اُس کو مجرم کہتے ہو۔ مدعا ہم کو دست نارسا کا طعنہ دینا ہے[1]

دیکھئے خاک میں ملاتی ہے — نگہ چشم سرمہ سا کب تک

شارح :- ”سرمہ اور خاک کی مناسبت ظاہر ہے۔ ملاتی۔ ملاتی رہے گی۔“

جی نہیں۔ ”ملاتی ہے“ کے معنی یہ ہیں کہ کس وقت ملائے گی یعنی ہم آرزو مند ہیں کہ ملائے۔[2]

نہیں پاتے اثر اپنا یہ غیرت کا اثر دیکھا — کہا کرتے تھے بیتابی کو سب بے تاثیر اکثر ہم

شارح :- ”ہم اپنی بیتابی کو بے اثر کہا کرتے تھے۔ آخر بیتابی کو غیرت آگئی۔ اور اس نے یہ اثر دکھایا کہ ہمارا ہی اثر (نشان) باقی نہ رہا یعنی بے تابی نے تاثیر تو دکھائی مگر وہ ہمارے خلاف پڑی۔“

شاعر نے یہ نہیں کہا تھا کہ بیتابی نے اپنا اثر دکھایا۔ وہ غیرت کا اثر بیان کرتا ہے۔ تخیل یہ ہے کہ ہم خود بیتابی کو اکثر بے اثر کہتے تھے۔ اب محبوب نے بے اثر کہا ہم غیرت سے مٹ گئے[3]

---

[1] (نگار) زلیخا کے ہاتھ کا دامن یوسف تک رسا ہونا کامیابی کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ اعتراض کہ یوسف کے دامن تک زلیخا کا ہاتھ پہونچ کر اس میں چاک پیدا کر چکا تھا درست نہیں ہو سکتا۔ تاہم شارح کا یہ کہنا کہ معشوق زلیخا کو اس کا طعنہ دیتا ہے درست نہیں۔ مفہوم یہی ہے کہ وہ بظاہر ذکر تو زلیخا کا کرتا ہے لیکن مقصود مومن کی سعی ناکام پر طنز کرنا ہے۔

[2] (نگار) شارح نے یقیناً غلطی کی ہے اور معترض نے مفہوم کو صحیح سمجھا ہے۔

[3] (نگار) محبوب کا بیتابی کو بے اثر کہنا اور غیرت سے عاشق کا مٹ جانا شعر سے ظاہر نہیں۔ مفہوم صرف اتنا ہے کہ ہم اپنی بیتابی پر بے اثر ہونے کا الزام لگایا کرتے تھے آخر کار اسے غیرت آہی گئی اور ہمیں مٹا کر رکھ دیا۔

قیس شوخ اب کیونکہ دعوی ملک وحشت کا کرے، مُہرِ محضر ہو گیا نقشِ سمِ آہو ہمیں

شارح :- "اس شعر میں "شوخ" بمعنی محبوب قیاس کیا ہے اور منادے قرار دیا ہے"

حالانکہ شوخ، قیس کی صفت ہے مقصود یہ کہنا ہے کہ قیس نے شوخ چشمی سے دعوائے وحشت کیا تھا مگر وہ دعوی ہمارے عہد میں نہیں چل سکتا۔ [1]

چشم وا نے نابینا کر دیا جدائی میں کوئی آنکھ لگتی ہے خواب وصل کیا دیکھیں

شارح :- "ہجر میں انتظار کی بدولت عاشق کی آنکھیں کھلے کھلے بصارت سے معذور ہو گئیں۔ اس کی نئی توجیہ یوں کرتا ہے کہ انتظار میں آنکھ تو لگتی نہیں۔ اور جب آنکھ نہیں لگتی تو خواب وصل کیونکر نظر آئے اور جسکو کوئی چیز نظر نہ آئے (خواہ وہ خواب ہی کیوں نہ ہو) وہ لازماً نابینا ہی کہلائے گا اس میں ندرت یہ ہے کہ چشم وا کی طرف نابینائی کو منسوب کیا گیا"

اگر مولانا یہ فرماتے کہ آنکھ کا عرصہ تک کھلا رہنا نابینائی کا سبب ہے۔ یا عرصہ تک آنکھ کھلے رہنے کا سبب جدائی میں انتظار ہے تو صحیح تھا۔ لیکن نابینائی کی یہ توجیہ کہ خواب نظر نہیں آیا۔ بہت عجیب ہے اور یہ بات کہ جس کو کوئی چیز خواہ وہ خواب ہی کیوں نہ ہو نظر نہ آئے لازماً نابینا کہلائیگا، سمجھ میں نہیں آتی۔ [2]

اتنی بھی تاب دوری خورشید طلعتاں نقصاں کیا کمال سے آیا ہے ماہ میں

شارح :- "چاند کمال کی حالت میں خورشید سے دور تر ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد ناقص ہونا شروع ہوتا ہے شاعر کہتا ہے خورشید طلعتوں (حسینوں) کی اتنی جدائی بھی اچھی نہیں دیکھو چاند کا کمال اس کے لئے نقصان کا موجب ہے۔ مصرع ثانی بطور تمثیل ہے۔"

جب حالت کمال میں ماہ خورشید سے دور تر ہوتا ہے۔ تو حالت نقصان میں یقیناً مقابلۃً قریب ہوا۔ پھر گزشتہ کمال کو نقص کی علت کیوں کہیں۔ قرب ہی نقصان ماہ کی علت قریبہ ہے۔ لہٰذا حسینوں سے دوری اچھی۔

دوری سے بُعد مکانی مراد نہیں ہے۔ ہجر مراد ہے۔ چاند کامل ہوتا ہے۔ جب زمین شعاع مہر

---

[1] (نگار) میری رائے میں بھی شوخ کو منادی قرار دینا درست نہیں۔

[2] (نگار) شارح نے بالکل صحیح سمجھا ہے، اور معترض کا اعتراض درست نہیں۔

کے لیے قطعاً حاجب نہو۔ اس حالت کمال میں ہجر بدستور ہے۔ اتصال نہیں۔ لہذا چاند کی چمک دمک بحالت کمال باوجود عدم اتصال شاعر کی نظر میں عین نقص ہے۔ وہ کہتا ہے۔ اس قدر تاب، دوری عجیب ہے کہ ماہ بحالتِ عدم اتصال مہر۔ کاہیدہ و زار و نزار نہیں ہے[1]۔

پردہ نشیں کے عشق میں پردہ دری نہو کہیں　　　ہوتی ہیں بے حجابیاں جانِ نہفتہ راز میں

شارح :۔ "جانِ نہفتہ راز۔ جان جس کا راز مخفی ہے۔ میری جان پردۂ راز سے نکل کر بے حجاب ہو رہی ہے۔ اور میں مر رہا ہوں۔ اس حالت میں اگر کوئی اندیشہ ہے تو یہ کہ کسی پردہ نشین کا رازِ عشق افشا نہو جائے"۔

ہم نے کسی جان کو پردۂ راز سے نکلا ہوا بیحجاب نہیں دیکھا۔ خیریت ہے مولانا نے "ہو رہی ہے" کہا اگر ہو گئی کہتے تو ہم مومن کی جان کو دیکھنے عدم آباد جاتے۔ یہ بھی نہیں کہا ہے کہ میں افشائے راز کے اندیشہ سے مر رہا ہوں۔ اور "مر رہا ہوں" حقیقی معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ موت کا شعر میں کہیں ذکر نہیں ہے۔ نہ موت جان کی پردہ در ہو سکتی ہے۔ شعر میں بجائے "جانِ نہفتہ راز" کے "حالِ نہفتہ راز" ہے اور اس طرح مطلب صاف ہو جاتا ہے[2]۔

درد بے درماں مرا منت کشِ مرہم نہیں　　　داغ نو ہے چارۂ داغ کہن کی فکر میں

شارح :۔ "میں جب داغ کہن کے علاج کی فکر کرتا ہوں تو ایک نیا داغ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ میرا لاعلاج مرض محتاج مرہم نہیں"۔

میں علاج کی فکر کرتا ہوں شعر میں نہیں ہے۔ فکر علاج سے جدید داغ پیدا ہونا بھی غلط ہے مرض کا لاعلاج کہنا بھی شاعر کا مقصود اصلی نہیں ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ داغ نو داغ کہن کا علاج ہے۔ میرا دردِ بے درماں مرہم کا احسان مند نہیں ہے۔ مدعا یہ ہے کہ نو بنو آلام و افکار گزشتہ غم کو خود بھلاتے رہتے ہیں۔ صائب نے اس مضمون کو ایک جگہ اس طرح ظاہر کیا ہے۔

داغ است بجاں مرہم داغے کہ کہن شد　　　ہم نقش قدم محو کند نقش قدم را[3]

---

[1] (نگار) غور طلب یہ ہے کہ لفظ "کیا" مومن نے کس معنے میں استعمال کیا ہے۔ یعنی یہ محل استفسار ہے یا محل استعجاب۔ میری رائے میں یہاں محلِ استعجاب میں استعمال کیا گیا ہے اور مفہوم یہ ہے کہ ماہ کامل کا نقصان اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اس حالت میں خورشید سے بعید تر فاصلہ پر واقع ہے۔ [2] (نگار) معترض نے اعتراض تو کر دیا لیکن خود کوئی مفہوم نہ بتایا۔ میری رائے میں یہاں "جانِ نہفتہ راز" ہی ہے اور جان کو حال سمجھنا درست نہیں۔ دوسرے مصرعہ میں مومن نے یقیناً اپنی مرگ کی طرف اس اندیشہ کا اشارہ کیا ہے اور مقصود یہ ہے کہ میری موت کسی پردہ نشیں کی عشق کی پردہ دری نہ کرے۔ [3] (نگار) شارح نے اس شعر کا مفہوم سمجھنے میں واقعی غلطی کی ہے اور مقالہ نگار کا اعتراض و مفہوم دونوں درست ہیں۔

بس کہ بن آئے مرگئے ہم شب انتظار میں دن جو رہے تھے عمر کے جیتے رہے مزار میں

شارح :۔ " چونکہ ہم بن موت آئے قبل از وقت شب انتظار میں مرگئے تھے۔ اس لئے عمر کے باقی دن جو رہ گئے تھے قبر میں کاٹنے پڑے "

" بن آئے مرنے " سے حقیقتاً مرجانا مراد نہ تھا۔ نہ مزار میں جیتے رہنے کا مدعا واقعی تربت میں سانسیں پوری کرنا تھا۔ پہلے مصرع میں شب انتظار کی زندگی کو موت کہا ہے۔ اور دوسرے میں ایام مابعد کو مزار جلنے سے تعبیر کیا ہے [1]

کشتۂ یار ہوں اس رشک سے مرتا ہے جہاں وہ بھی کیا ہیں جو مری موت کا غم کرتے ہیں

شارح :۔ " وہ لوگ بھی عجیب قسم کے ہیں جو میرے مرنے کا غم کرتے ہیں۔ کیونکہ انھیں در اصل یہ میرا غم نہیں بلکہ یہ رشک ہے کہ یہ (مومن) کشتۂ یار ہوا ہم کیوں نہ ہوئے "

غم کرنے والوں کو غم نہیں رشک ہے شاعر نے نہ کہا تھا۔ مولانا " جہاں " سے منطقی طور پر غم کرنے والوں کو مستثنےٰ نہ کر سکے۔ شاعر کی غرض یہ تھی کہ چند افراد کے سوا سارا عالم میری موت پر غم کرتا ہے اور یہ چند حضرات غم کرنے والے عجیب مٹی کے بنے ہوئے ہیں کہ میری موت پر روتے ہیں [2]

دشمن سے ہے چشم مہربانی محروم نگاہ آشنا ہوں

شارح :۔ " چشم بمعنی توقع۔ آشنا سے محبوب مراد ہے "

دشمن سے محبوب مراد ہے۔ اور نگاہِ آشنا سے نگاہِ باخبر [3]

شبِ وصل اسکے تغافل کی زبس تاب نہیں تلخی مرگ ہے آنکھوں میں شکر خواب نہیں

---

[1] (نگار) شارح نے مطلب صحیح سمجھا ہے۔

[2] (نگار) شارح اور معترض دونوں نے غلطی کی ہے۔ مومن کا مدعا صرف یہ ظاہر کرنا ہے، میرا کشتۂ یار ہونا ایسا واقعہ ہے جو سارے جہاں کیلئے باعث رشک ہے اس لئے مجھے حیرت ہے ان پر جو میرے مرنے کا غم کر رہے ہیں حالانکہ انھیں بھی صرف رشک کرنا چاہئے۔

[3] (نگار) مطلب کسی نے بیان نہیں کیا۔ مدعا یہ کہنا ہے کہ نگاہِ آشنا سے میری محرومی اب اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ دشمن سے اب اس کی توقع رکھنے لگا ہوں۔

شارح :- "مجھے شبِ وصل یہ بھی گوارا نہیں کہ ذرا دیر کو بھی محبوب مجھ سے غافل ہو - اگر ایسا ہو تو میرے لئے پیام موت ہے - اس لحاظ سے شبِ وصل اُس کی آنکھوں میں جو نیند آرہی ہے اس کے لئے شکرِ خواب ہو مگر میرے حق میں تلخیٔ مرگ ہے کہ اتنی دیر وہ مجھ سے غافل رہے گا - یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ میری آنکھوں میں جو شکرِ خواب وصل کا اثر ہے دراصل میرے لئے تلخیٔ مرگ کا حکم رکھتا ہے - کیونکہ اتنی دیر بھی محبوب سے غفلت مجھ کو گوارا نہیں مگر اس صورت میں مصرعِ اول میں " اس سے تغافل " ہونا چاہیئے "

مجھے دونوں معنے سے اتفاق نہیں - مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ وصل کی شب اس سے غفلت برتنے کی مجھے تاب نہیں - وصل کی شب جو بظاہر میں میٹھی نیند سو جاتا ہوں - یہ حقیقتاً تلخیٔ مرگ ہے [1]

سرفروشوں کے اگر آپ خریدار ہوئے	تو گراں ہووے گی وہ جنس جو کمیاب نہیں

شارح :- " یعنی اس صورت میں یہ جنس کم ارز گراں قیمت ہو جائے گی "

جنس سے مراد سرفروش نہیں ہو سکتے - شاعر کبھی یہ نہیں کہنا چاہتا کہ سرفروش جانباز عشاق ہزاروں ہیں کمیاب نہیں - مصرعہ ثانی میں صاف " وہ جنس جو کمیاب نہیں " کہا ہے ، جنس سے مراد ہوس ہے یعنی اہلِ ہوس مراد ہیں جن کی جانب التفات ہے اور وہ کمیاب نہیں ہیں اگر سرفروشوں کی خریداری دربارِ حسن میں ہوئی تو اہلِ ہوس مٹ جائیں گے یعنی جو چیز کمیاب نہیں ہے وہ گراں قیمت ہو جائے گی [2] -

---

لذت بغیر جاں دہی مردگاں محال	آبِ بقا فشردۂ دامانِ تر نہو

شارح :- آبِ حیات سے مردوں میں جان آتی ہے - مگر جب تک آبِ حیات میں لذت نہ ہو گی جاں بخشی کا اثر ہونا معلوم - اس سے ثابت ہوا کہ اس میں لذت ضرور ہے - اب چونکہ شاعر کے نزدیک تمام لذتوں کا سرچشمہ دامانِ تر ہے - اس لئے قیاس چاہتا ہے کہ آبِ حیات دامانِ تر کا نچوڑ ہو اور اسی لئے اُس میں اسقدر مزہ ہے - دامانِ تر - (دامن گناہ آلودہ) سے لذت کا تعلق بدیہی ہے "

آبِ حیات کا اثر زندوں کو موت سے محفوظ رکھنا سنا گیا ہے - نہ کہ مردوں کا زندہ کرنا - یہاں جاں دہی سے جان دینا یعنی جان فدا کرنا مراد ہے - یعنی آبِ حیات کی تمنا میں جنھوں نے جان دی ہے ان کا جان دینا اس کا ثبوت ہے کہ آبِ حیات فشردۂ دامانِ تر ہو گا - لذتِ گناہ ظاہر ہے [3] -

---

[1] (نگار) شارح کا مطلب درست ہے -	[2] (نگار) شارح نے واقعی صحیح مطلب نہیں سمجھا -

[3] (نگار) مقالہ نگار کی توجیہ میری سمجھ میں نہیں آئی - میرے نزدیک شارح نے مفہوم صحیح سمجھا ہے -

یارب کوئی معشوقہ دلجو نہ ملے اب — جو اُن کی دعا ہے وہی اپنی بھی دعا ہے

شارح :- "دعا دونوں کی ایک ہے مگر نیت مختلف، معشوق عاشق سے ناراض ہوکر دعا کررہا ہے - اور عاشق عشق سے بیزار ہوکر"

دلجوئی - دلدہی اور طلب دل کے معنی میں ہے - دونوں معنی شاعر نے ملحوظ رکھے ہیں ان کی دعا بمعنی اول اور اپنی دعا بمعنی ثانی ہے - عشق سے بیزاری کا ذکر کہیں نہیں ہے۔[ا]

توبہ گنہ عشق سے فرمائے ہے واعظ — یہ بھی کہیں دل دیکے گنہگار ہوا ہے

شارح :- "مراد یہ ہے کہ اگر واعظ گنہگار نہ ہوتا تو توبہ کیوں کرتا فرمائے ہے طنزاً استعمال کیا ہے"

میری رائے میں معنی یہ ہیں کہ واعظ ہمیں گناہ عشق سے توبہ کا حکم دیتا ہے - کیا کبھی اس نے بھی گناہ عشق کیا ہے (یعنی نہیں کیا ہے) اگر گناہ عشق واعظ سے سرزد ہوتا - تو جانتا کہ عشق سے توبہ امکانی نہیں ہے - اگر مصرع ثانی کو جملہ خبریہ مانا جائے تو بھی یہ معنی ہوتے ہیں کہ گناہ عشق کے نتائج دیکھ کر ہمیں ہدایت کرتا ہے مگر پہلے معنی لطیف تر ہیں۔[۲]

سمجھ کے اور ہی کچھ مر چلا میں اے ناصح — کہا جو تو نے نہیں جان جا کے آنے کی

شارح :- "ناصح نے سمجھایا کہ جان جا کر آنے والی نہیں - جس سے اس کی مراد یہ تھی کہ عمر چند روزہ کو مغتنم سمجھو اور عمل خیر کی طرف توجہ کرو عاشق اپنی خوش فہمی سے یہ سمجھا کہ جب زندگی کا اعتبار نہیں تو جہاں تک ہوسکے کاروبار عاشقی سے غافل نہ رہنا چاہئے - مر چلا - مرنے لگا عشق کرنے لگا"

میری رائے میں شاعر نے "جان" سے محبوب کی ذات مراد لی اور جدائی میں یہ خیال کہ اب نہ ملیں گے - قیامت ہوگیا[۳]

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہونگے — فلس ماہی کے گل شمع شبستاں ہونگے

شارح :- "سوختہ ساماں = بے سروساماں - گل شمع شبستاں = شمع کاشانہ کا گل - ہم سوختہ ساماں جب زمین میں دفن ہونگے - تو ہماری سوختہ سامانی کے اثر سے ماہی زمین کے سینے بھی گل شمع کی طرح جلنے لگیں گے یا گل شمع کا کام دینگے"

یہ شعر تکلف و تصنع سے خالی نہیں ہے - میرے خیال میں فلس ماہی کا جل اُٹھنا شاعر کا مقصود نہیں ہے -

---

[ا] (نگار) مطلب وہی ہے جو شارح نے ظاہر کیا ہے اور مقالہ نگار کا یہ خیال کہ دلجوئی یہاں طلب دل کا بھی مفہوم پیدا کرتی ہے - درست نہیں۔

[۲] (نگار) فارسی میں توبہ کردن اور توبہ فرمودن دونوں جدا جدا مفہوم میں مستعمل ہیں - اول الذکر توبہ کرنے کے معنے میں آتا ہے اور موخر الذکر توبہ کی تعلیم دینے کے معنے میں آتا ہے ذیل کے مصرعہ میں ان دونوں کا فرق ملاحظہ ہو - توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند - اس لئے شارح کا مفہوم یقیناً صحیح نہیں ہے۔ [۳] (نگار) مقالہ نگار نے صحیح سمجھا ہے۔

وہ یہ کہتا ہے کہ ہم سوختہ ساماں بعد دفن فلس ماہی کی شبستاں میں گل شمع ہو جائیں گے۔ آتش موجب تنویر ہے۔ اور جل بجھنا ہم بے سامانوں کی تقدیر۔ لہٰذا گل شمع ہوں گے۔ اور ماہی کے شبستاں میں نہیں بلکہ فلس ماہی کے شبستاں میں۔ فلس ماہی خود سراپا داغ ہے۔ اس کے لئے شبستاں اور شمع فرض کر کے اپنے سوختہ ساماں وجود کو گل شمع کہا ہے۔[1]

مجھ کو مارا مرے حال متغیر نے کہ ہے　　　کچھ گماں اور ہی دھڑکے سے دلِ مونس کے

شارح "مونس سے ہمدم یا ہمنشیں مراد ہے۔ میرا حال دگرگوں (متغیر) دیکھ کر ہمدم کا دل دھڑکتا ہے۔ اور مجھے اور ہی کچھ گمان ہے (یعنی اب نہ بچوں گا) اس حالِ متغیر نے مجھے تباہ کر دیا۔ نہ یہ ہوتا نہ ہمدم کا دل دھڑکتا اور نہ مجھے بدگمانی ہوتی۔ لطف یہ ہے کہ عاشق کو خود اپنی حالت کا احساس نہیں۔ ہمدم کا حال دیکھ کر اسکو اندیشہ ہوا۔"

اگر دق میں حال دگرگوں ہو تو ضرور یہ اندیشہ ہو سکتا ہے کہ اب نہ بچوں گا مگر عاشق اس اندیشہ سے فارغ ہے گماں یہ ہے کہ ہمدم کی نظر میں اب میرا مداوا ممکن نہیں۔ یا یہ کہ ہمدم کا دل میرے لئے کیوں دھڑکتا کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ خود محبوب پر فریفتہ ہو گیا ہو۔[2]

ناتوانی سے نزاکت ہے زیادہ　　　مجھسے تو دامن چھڑانا چھوڑ دے

شارح: "تو نازک ہے میں ناتواں۔ پھر بھی میں اس قدر ناتواں نہیں کہ تو مجھسے اپنا دامن چھڑا سکے۔"

شاعر کہتا ہے کہ نزاکت کو ناتوانی پر یقیناً فوقیت حاصل ہے اس لئے تو مجھ سے دامن نہ چھڑا کہ یہ بات ثابت ہو جائے۔[3]

کس طرح مایوس ہوں تاثیر سے　　　دم رکے ہے نالۂ شبگیر سے

شارح: "نالۂ شبگیر (پچھلے پہر کا نالہ) سے سانس رکنے لگتی ہے۔ اور نالہ لب پر نہیں آتا۔ اگر لب پر آ سکے اور تاثیر نہ ہو۔ تب مایوسی کا موقع ہے"

---

[1] (نگار) شارح کا مفہوم صحیح ہے اور مقالہ نگار کی تاویل بالکل دور از کار۔

[2] (نگار) شارح نے مفہوم صحیح سمجھا ہے۔

[3] (نگار) شارح مومن کے مدعا تک نہ پہنچ سکے۔ شاعر صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ مقابلۃً معشوق کی نزاکت عاشق کی ناتوانی سے بڑھی ہوئی ہے اس لئے اگر اس نے دامن چھڑا لیا تو یہ نزاکت کے منافی ہوگا۔

نالہ کا لب پر نہ آنا شعر میں کہاں ہے۔ دم کا رکنا اس کو مستلزم نہیں۔ کہ نالہ لب تک نہ آئے۔ اور اگر نالہ لب پر نہیں آتا تو تاثیر کیا ہوگی۔ پھر مایوسی کیوں نہیں؟

شاعر کہتا ہے نالہ سے دم رکتا ہے۔ یعنی دم رکنا نالہ کا اثر ہے۔ پھر تاثیر سے مایوس کیوں ہو۔[۱]

کام ہوتے ہیں جوانوں کے سپہر پیر سے　　لے گیا ہے پشت خم شاید تری شمشیر سے

شارح: وہ آسمان پیر ہے اور اس کی پشت خم ہے۔ مگر اس کے باوجود جوانوں کے سے کام کرتا ہے۔ شاید تری شمشیر خمیدہ سے پشت مستعار لے گیا ہے۔ جو یہ حال ہے۔ یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ اسکے ہاتھوں سے جوانوں کے کام تمام ہوتے ہیں"

شمشیر کا لفظ چاہتا ہے کہ کام سے ستمگری مراد ہو۔ اس کے سوا یوں بھی آسمان جفاکاری میں بدنام ہے شرح میں صرف یہ نہ کہنا تھا کہ جوانوں کے سے کام کرتا ہے۔ پشت مستعار لے جانا بھی کوئی ٹھکانے کی بات نہیں۔ پشت کچھ ذریعۂ ستم نہیں۔ پہلے مصرع میں "کام ہوتے ہیں جوانوں سے" اس سے یہ معنی ہیں کہ جوانوں کے کام تمام ہوتے ہیں۔ طریقۂ گزارش سے مستنبط نہیں ہو سکے۔

پشت خم کردن۔ پشت دوتا کردن۔ عاجزی، فروتنی کرنا ہے۔ شاعر نے اس اصطلاح کا ترجمہ کیا ہے۔ یا ترجمہ بالفاظ موزوں نہ ہوا۔ یا کاتب نے کچھ اصلاح کی یا ممکن ہے پشت خم از کسے بردن بھی اس معنی میں مستعمل ہو۔ معنی بہرحال یہی ہیں کہ آسمان نے غالباً تمہاری شمشیر کے سامنے پشت دوتا کی ہو کہ ستم شعاری میں باوجود خمیدہ پشت ہونے کے جوانوں کی طرح مشاق ہے۔[۲]

تنویر قادری

۱۔ (نگار) ہو سکتا ہے کہ مومن کا مقصود وہی ہو جو مقالہ نگار نے ظاہر کیا ہے۔

۲۔ (نگار) مقالہ نگار کی دور از کار تاویل میری سمجھ میں نہیں آئی کام ہونا، کام تمام ہونا کے معنے میں کبھی استعمال نہیں ہوتا۔

ضرورت ہے

سنہ ۲۲ء فروری تا جون - اگست و نومبر سنہ ۲۳ء مارچ اپریل اگست و دسمبر - سنہ ۲۴ء ستمبر - سنہ ۲۵ء جنوری اگست - اکتوبر، نومبر و دسمبر - سنہ ۲۶ء مارچ تا مئی - ستمبر تا دسمبر سنہ ۲۷ء فروری - جولائی تا دسمبر - سنہ ۲۸ء جنوری، فروری - اپریل تا جولائی - ستمبر تا دسمبر - سنہ ۲۹ء جنوری، اپریل تا جولائی - ستمبر تا نومبر - سنہ ۳۰ء جنوری، اپریل تا جولائی - دسمبر - سنہ ۳۱ء جنوری، اپریل و مئی - سنہ ۳۲ء اپریل - سنہ ۳۳ء جون - اگست و ستمبر - سنہ ۳۴ء جنوری، فروری، اگست و نومبر - سنہ ۳۵ء اکتوبر -

منیجر نگار - لکھنؤ

ایک لاسلکی ڈرامہ

اسوقت ہندوستان میں آٹھ نئی لاسلکی نشرگاہیں قایم ہورہی ہیں، اور خیال کیا جاتا ہے کہ آیندہ پندرہ سال کے اندر یہ تعداد کم از کم پچاس تک پہونچ جائے گی۔

اس وقت جتنے اسٹیشن کام کر رہے ہیں ان میں دہلی کا اسٹیشن مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور اسمیں شک نہیں کہ اس نے گزشتہ ایک سال کے اندر غیر معمولی شہرت حاصل کرلی ہے۔ موسیقی کے علاوہ اس نے اچھے اچھے مقالے بھی نشر کئے اور تفریح و افادہ دونوں باتوں کو پیش نظر رکھ کر اپنا پروگرام مرتب کیا لیکن اس کو یہ شکایت ہمیشہ رہی کہ لاسلکی ڈرامہ لکھنے والے میسر نہیں آتے، اس کی یہ شکایت درست ہے کیونکہ لاسلکی ڈرامہ میں جن خصوصیات کا پایا جانا ضروری ہے اس سے ہمارے اکثر انشاپرداز ناواقف ہیں۔

چونکہ لاسلکی ڈرامہ کا تعلق صرف سامعہ سے ہوتا ہے اور ایکٹ کرنے والے سامنے نہیں ہوتے اس لئے اسکی ترتیب میں ایسی چیزیں نظر انداز کرنا پڑتی ہیں جن کا تعلق باصرہ سے ہے اور انھیں سامعہ کے حدود میں لاکر پیش کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کو مختصر ہونا چاہئے۔ آدھ گھنٹے سے زیادہ کا کوئی ڈرامہ پیش کرنا اصول کے خلاف ہے۔ انھیں خصوصیات کو سامنے رکھ کر ذیل میں ایک ڈرامہ جو میں نے خود اپنے ایک افسانہ کو سامنے رکھ کر مرتب کیا ہے، پیش کرتا ہوں۔

نیاز

(حقوق نشر محفوظ ہیں)

افراد:-

انتظام علی:- معاشیات کے پروفیسر، شعر و موسیقی سے بالکل بیگانہ لیکن بیوی سے محبت کرنے والے

ثریا بیگم:- پروفیسر صاحب کی جدید تعلیم یافتہ بیوی، شاعری کی دلدادہ، گھر کی طرف سے ایک حد تک غافل لیکن شوہر کی مطیع

گلشن:- گھر کی پرانی ضعیف خادمہ

اختر:- پروفیسر صاحب کے دوست

(۱)

(پروفیسر صاحب۔ مکان کے اندر داخل ہوتے ہیں[۱] (دروازہ کھلنے کی آواز پھر پاؤں کی چاپ۔)[۲]

انتظام علی — "گلشن، گلشان!"

گلشن — (دور کی آواز سے) "حاضر ہوئی حضور"

(تیز قدموں کی آواز)

انتظام علی — "کیا تم کچھ کام کر رہی تھیں، گلشن!"

گلشن — "پتیلی چڑھا رہی تھی میاں!"

انتظام علی — "بیگم کہاں ہیں؟"

گلشن — "وہیں باورچیخانہ میں ہیں؟"

انتظام علی — "کیا کر رہی ہیں؟"

گلشن — "کچھ لکھ رہی ہیں"

انتظام علی — "اور گنگنا بھی رہی ہیں؟"

گلشن — (دبی زبان سے رُک رُک کر)۔ "ہاں۔ میاں۔ کبھی کبھی۔ گنگنانے بھی لگتی ہیں"

انتظام علی — "شعر کہہ رہی ہوں گی۔ وہ تو میں جانتا ہوں کہ ہمیشہ کام ہی کے وقت ان پر شاعری کا دورہ پڑتا ہے، خیر، ذرا خیال رکھنا، اختر صاحب بھی کھاتے ہیں ——"

(دور سے "گلشن، گلشن" کی آواز سُنائی دیتی ہے اور گلشن تیز قدموں کے ساتھ واپس جاتی ہے۔)

وہی آواز — "کمبخت، مر گئی جاکر، جب دیکھو کام ہی کے وقت غائب ہوتی ہے"

انتظام علی — (بلند آواز سے) "بیگم، ذرا ادھر تو آؤ" (دروازہ کھلنے کی آواز)

ثریا بیگم — (غصہ کے لہجہ میں)، "کیوں کیا کہتے ہو؟"

انتظام علی — "یہ اتنی خفگی گلشن پر کیوں ہو رہی ہے۔ خیریت تو ہے؟"

ثریا بیگم — (تیز غصہ کی آواز سے) "سالن جلکر کوئلہ ہوگیا، خدا جانے پتیلی چڑھاتے چڑھاتے کہاں غائب ہوگئی مردار، اب کیا میں اپنا سر کھانے کو دوں گی"

---

[۱] معلن ([illegible]) اس کا اظہار کریں گے — [۲] لاسلکی ڈرامے چونکہ رکارڈ کرنے کے بعد پیش کئے جاتے ہیں اس لئے ان میں ہر قسم کی آوازیں مصنوعی طور پر مرتسم کردیجاتی ہیں۔

انتظام علی — (نرم آواز سے) "مگر تم تو وہاں موجود تھیں"

ثریا بیگم — (برہمی کے تیز لہجہ سے) "تھی! تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ میں ہر وقت چولھے میں سر ڈالے بیٹھی رہتی"

انتظام علی — (نرم مگر طعنہ آمیز لہجہ سے) "مگر بیگم، یہ تو کوئی نئی بات نہیں ہے، تمھاری شاعری سلامت چاہئے سالن جلتا ہی رہیگا، روٹیاں جھلستی ہی رہیں گی۔ اس میں خفا ہونے کی کونسی بات ہے"

ثریا بیگم — (بگڑ کر) "میں پوچھتی ہوں کہ تمھیں میرے لکھنے پڑھنے سے کیوں بیر ہے۔ تم اگر یہ چاہتے ہو کہ میں بھی ہر وقت تمھاری طرح اس فکر میں مبتلا رہوں کہ غلہ کا کیا نرخ ہے، کپڑے کا کیا بھاؤ ہے۔ کتنا سونا ہندوستان سے باہر جا رہا ہے، کتنی شکر جاوا سے ہندوستان آرہی ہے، تو میں صاف صاف کہے دیتی ہوں کہ یہ میرے بس کی بات نہیں۔ میں تمھارے کام میں حارج نہیں تو تمھیں کیوں میرا مشغلہ برا معلوم ہو، خوب!"

(باہر سے "گلشن، گلشن" کی آواز آتی ہے)

انتظام علی — (آہستگی سے لیکن غصہ کے انداز میں) "اختر آ گئے ہیں، میں باہر جاتا ہوں، کھانا بازار سے آجائیگا، آپ جائیے شعر کہیئے"۔

[قدموں کی چاپ اور پھر دروازہ کھلکر بند ہونے کی کرخت آواز]

اختر — "خیریت تو ہے، اس وقت اندر کیا کر رہے تھے؟"

انتظام علی — (مایوسی کے لہجہ میں) "کر کیا خاک رہا تھا، اب تو تمھاری بھابھی کی شاعری میری برداشت سے باہر ہوتی جاتی ہے"

اختر — (ہنسکر) "شاعری کرتی ہیں تو کرنے دو، تمھارا اس میں کیا نقصان ہے؟"

انتظام علی — "ہونہہ، تمھیں کیا خبر کہ ان کا ایک ایک شعر میرے لئے کتنا قیمتی ثابت ہوتا ہے، آج ہی انھوں نے ایک شعر کہا، لیکن اُسوقت جب گوشت جلکر خاک سیاہ ہوگیا، پرسوں بھی خیر سے ایک شعر فرمایا تھا لیکن جب بلی سارا دودھ پی چکی۔ کل ہی کی بات ہے کہ بندر ان کے پاس سے میری شیروانی اُٹھا کر لے گیا، اُدھر جب وہ تار تار ہوچکی تو ادھر شعر پورا ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ مشقِ سخن چند دن اور جاری رہی تو دیوان پورا ہونے سے پہلے ہی یہاں دیوالہ نہ نکل جائے"

اختر — (قہقہہ لگاتے ہوئے) "بھئی، برا نہ مانو تو کچھ کہوں۔ بات یہ ہے کہ کچھ قصور تمھارا بھی ہے"

انتظام علی — "میرا، میرا کیا قصور ہے؟"

اختر — "یہی کہ تم انکے ذوق کا خیال نہیں رکھتے، اگر کبھی کبھی تم بھی شعر و شاعری سے دلچسپی لے لیا کرو تو کیا حرج ہے"

انتظام علی — "عجیب باتیں کرتے ہو۔ مجھے جب ایک چیز سے لگاؤ ہی نہیں تو کیا خاک دلچسپی لے سکتا ہوں"

اختر — "تاہم محض ان کی دلدہی کے لئے اگر مصنوعی طور پر اس کا اظہار ہو تو کیا نقصان ہے"

انتظام علی — (ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے)۔ "بہتر ہے یہ بھی کر دیکھوں گا"

—— (۲) ——

ایک ہفتہ کے بعد۔ ثریا بیگم چوکی پر بیٹھی ہوئی چھالیہ کتر رہی ہیں
انتظام علی ایک کتاب ہاتھ میں لئے ہوئے اندر داخل ہوتے ہیں۔
(چھالیہ کترنے کی آواز اور پھر قدموں کی چاپ)

انتظام علی — "بیگم، تمہارے لئے ایک عجیب چیز لایا ہوں، یہ لو جرمنی کا چھپا ہوا دیوان غالب، دیکھو کتنا خوشنما ہے"
(تھوڑے وقفہ کے بعد) ورق اُلٹنے کی آواز

ثریا بیگم — "بیشک بہت خوبصورت ہے"

انتظام علی — "غالب واقعی اچھا شاعر تھا"

ثریا بیگم — "ہوگا، مجھے کیا معلوم"

انتظام علی — "ہوگا؟ اس کے کیا معنی۔ کیا تمہیں شاعری سے دلچسپی نہیں رہی"

ثریا بیگم — "جی نہیں"

انتظام علی — "اور یہ جو دو گھنٹے سر کھپا کر میں نے غزل کہی ہے، اسے کون سنے گا؟"

ثریا بیگم — (ہنستے ہوئے) "آپ اور غزل۔ کیا کہنا"

انتظام علی — "ہائیں، تم مذاق سمجھتی ہو، لو، سنو، ہر چند یہ میری پہلی کوشش ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ناکامیاب نہیں رہا۔ پہلا شعر— پہلے شعر کو مطلع ہی کہتے ہیں نا؟ اچھا تو مطلع سنو:—

ہم نہیں وہ جنھیں آتا ہی پریشاں ہونا   مفت میں بیٹھے بٹھائے یونہی حیراں ہونا

ثریا بیگم — "سبحان اللہ، کیا کہنا"

انتظام علی — "اچھا دوسرا شعر سنو اسی سلسلہ کا ہے:—

کفِ افسوس کا ملنا کسے کہتے ہیں جناب   نام کس چیز کا ہے سر بگریباں ہونا

ثریا بیگم — "تو یوں کہئے کہ آپ نے "نظم مسلسل" تحریر فرمائی ہے"

انتظام علی — "اسے نظمِ مسلسل کہتے ہیں؟ اچھا تو آج یہی سن لو، کل غزل بھی سُن لینا۔ تیسرا شعر اسمیں میرا نام بھی ہے:—

کس نے تم سے کہا وہاں جاکر بیاباں ہونا　　کیوں وہاں تم گئے بیکار اے انتظام

(ثریا بیگم کے قہقہہ کی آواز)

انتظام علی — "کیوں اس میں ہنسی کی کیا بات ہے"

ثریا بیگم — "آپ کا مقطع تو تقطیع سے بالکل گر گیا"

انتظام علی — "تقطیع سے گر گیا؟ گر جانے دو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ بیس دفعہ تم سے نہیں دیگچی چولھے میں گر گئی، شعر تقطیع سے گرا تو کوئی نقصان نہیں ہوا اور تم نے ہر مرتبہ دیگچی گرا کر کم از کم آٹھ آنے کا نقصان کیا۔

ثریا بیگم — پھر تم نے وہی طعن تشنیع کی باتیں شروع کر دیں"

انتظام علی — (نرمی سے) بگڑو نہیں، دیکھو اب میں شعر کہنے لگا ہوں — اور ہاں بیگم یہ جو غالب نے لکھا ہے:

"در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا" اس کا کیا مطلب ہے"

ثریا بیگم — "میں بھلا آپ ایسے قابل شخص کو کیا سمجھا سکتی ہوں۔ آپ کیوں مجھے بناتے ہیں

انتظام علی — "شعر کو قابلیت سے کیا واسطہ۔ یہ بھی کوئی ریاضی کا مسئلہ ہے، علم الکیمیا کا نظریہ ہے جسکے سمجھنے میں قابلیت کی ضرورت ہو۔ چند الفاظ خاص ترتیب سے جمع کر دئے اور کوئی مہمل سی بات کہدی، شعر ہو گیا"

ثریا بیگم — "بجا ہے، شعر کی یہ تعریف مجھے آج ہی معلوم ہوئی۔ میں تو سنا کرتی تھی کہ شعر فنون لطیفہ میں داخل ہے اور وہی شخص شاعری کر سکتا ہے جو قدرت کی طرف سے خاص دماغ لیکر آیا ہو اور ——"

انتظام علی — (بات کاٹ کر) شعر فنون لطیفہ میں داخل ہو یا فنون کثیفہ میں۔ اس سے بحث نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس سے دنیا کو کیا فایدہ پہونچتا ہے۔ زمانہ کی حالت تو یہ ہے کہ پیوند لگے ہوئے کپڑے بھی میسر آجائیں تو جانئے کہ بڑی دولت ہاتھ آگئی اور اُدھر جب دیکھئے دامن کا چاک گریباں سے پک سے ملا ہوا ہے۔ کوئی پوچھے کہ ان دھجیوں کو کوئی کہاں تک رفو کرے گا اور ایسی فضول خرچی کی تعلیم کا اثر ملک پر کیا ہوگا"

ثریا بیگم — "ماشاءاللہ خوب سمجھے ہیں۔ اس سمجھ کی داد دینی چاہئے"

انتظام علی — "خیر، جانے دو۔ یہ تو پھر جھگڑے کی بات شروع ہو گئی۔ یہ بتاؤ کہ میں نے غزل کیسی کہی"

ثریا بیگم — "کیا کہنا، جواب نہیں ہے"

انتظام علی — "اچھا تو اب روز دو غزلیں مجھ سے لیا کرو۔ اب تو تمہیں شکایت نہ ہوگی کہ مجھے شاعری سے لگاؤ نہیں۔ (پاؤں کی چاپ) —— کیوں کہاں جا رہی ہو"

"کہیں جا رہی ہوں، آپ کو کیا، آپ تو کپڑے پہنئے، کالج جانے کا وقت قریب ہے"

(کرسی سرکانے کی آواز۔ تخت کی چر چراہٹ)

—— (۳) ——

{ شام کا وقت - زنانخانہ کے برآمدہ میں ثریا بیگم چوکی پر بیٹھی ہوئی تلاوت قرآن میں مصروف ہیں —— تلاوت کی آواز لیکن نہایت دھیمی - اسی دوران میں دروازہ کھلنے، کسی کے چلنے اور پھر کرسی گھسیٹنے کی آواز آتی ہے }

انتظام علی —— "ہائیں، ابھی تک فارغ ہی نہیں ہوئیں، کیا آج پورا کلام مجید ختم کرنے کا ارادہ ہے"

("ہونہہ" کی آواز اور پھر تلاوت کلام مجید)

انتظام علی —— "اجی منھ سے بولو، یہ وظیفہ کبھی ختم بھی ہوگا یا نہیں۔ مجھے غزلیں سنانا ہیں، عشق و عاشقی کی باتیں کرنا ہیں اور آپ خدا سے لو لگائے بیٹھی ہیں"

(تلاوت کی آواز برابر آرہی ہے) — (کچھ وقفہ کے بعد)

انتظام علی —— "اچھا تم تلاوت کئے جاؤ، میں بھی غزلیں سناتا ہوں"

ثریا بیگم —— (غصہ کی آواز سے) لاحول ولا، ناک میں دم ہے - اس گھر میں نماز روزہ بھی دشوار ہو گیا ہے"

انتظام علی —— (نرمی سے) میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ جو دورہ آپ پر پڑا ہے کبھی ختم بھی ہوگا یا نہیں؟"

ثریا بیگم —— (بگڑ کر) توبہ کرو، توبہ، نماز روزہ کیا کوئی بیماری ہے جس کا دورہ پڑتا ہے، خوب! آپ کے یہاں مذہب کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے"

انتظام علی —— مذہب کے ساتھ کون برا سلوک کرسکتا ہے، نماز روزہ میرا ایمان ہے، لیکن میں تو یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس وقت تک تو تم نے کبھی بھولکر بھی سجدہ نہ کیا تھا، اب جو اس کا خیال آیا تو کیوں؟ اور وہ بھی اس شدت کے ساتھ کہ جب دیکھئے سفید چادر میں لپٹی ہوئی تیمم کا تودہ بنی بیٹھی ہیں"

ثریا بیگم —— "چلو ہٹو، مجھے ایسی باتیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں - اللہ رسول کے ساتھ مجھے مذاق پسند نہیں"

انتظام علی —— "مذاق - مذاق کیسا؟ میں تمھیں نماز پڑھنے سے نہیں روکتا، تلاوت سے باز نہیں رکھتا، لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوا کرتی ہے - نماز چھوڑی تو اس طرح کہ بھولے سے بھی کبھی خدا کو یاد نہ کیا اور اب جو عبادت پر آئیں تو اس شان سے کہ گھر کو مسجد بنا کے رکھدیا"

ثریا بیگم —— "خیر، ہوگا، کسی کو کیا؟ میں نماز نہیں پڑھتی تھی تو خدا کا گناہ کرتی تھی اور اب پڑھتی ہوں تو اپنے لئے پڑھتی ہوں - آپ کا اس میں کیا بیچ؟"

"میرا بیچ یہ ہے کہ جس دن سے تم نے نماز شروع کی ہے صرف دو غزلیں ہو کر رہ گئی ہیں ——

سُنانے کا موقعہ ملے تو اور کہوں ۔ مجھے تو اس مہینے میں پورا دیوان ختم کرنا ہے ۔ آخر یہ کام کیونکر چلیگا"

ثریا بیگم ــــ "آپ غزلیں کہے جائیے، مجھے سُنانے کی ضرورت ہی کیا ہے ؟"

انتظام علی ــــ "اور تم برابر اسی طرح رات دن نماز پڑھتی جاؤگی، مانوگی نہیں"

ثریا بیگم ــــ "نہیں مانونگی"

انتظام علی ــــ "بہتر ہے"

(کرُسی سرکانے اور چلنے کی آواز)

ــــــ(۴)ــــــ

(مرغ کے بولنے کی آواز - اِدھر اُدھر چلتے ہوئے قدموں کی چاپ)

ثریا بیگم ــــ (بلند آواز سے) "گلشن، گلشن"

گلشن ــــ (دور سے) "حاضر ہوئی، بیوی"

(گلشن کے قدموں کی آواز)

ثریا بیگم ــــ "میرا مصلا کیا ہوا"

گلشن ــــ "بیوی، مجھے کیا خبر، آپ نے جہاں رکھا ہوگا، وہیں ہوگا"

ثریا بیگم ــــ (بگڑ کر تیز آواز میں) سوائے چوکی کے اور کہاں رکھتی ہوں ۔ یہیں جا نماز تھی، یہیں کلام مجید تھا، اسی جگہ دلائل الخیرات تھی، تسبیح تھی، رحل تھی اور اب کسی ایک چیز کا پتہ نہیں"۔

گلشن ــــ "بیوی، بندر لے گیا ہوگا"

ثریا بیگم ــــ (طعن آمیز لہجہ میں) اور مصلے پر بیٹھا ہوا کلام مجید بھی پڑھ رہا ہوگا" نامعقول کہیں کی، جلد ڈھونڈھ کے لا، وقت جا رہا ہے"

گلشن ــــ "بیوی، میں کہاں دیکھوں، میں نے کہیں رکھا ہوتا تو لاکر دیدیتی"

(دروازہ کھلنے کی آواز اور قدموں کی آہٹ)

انتظام علی ــــ "بیگم، گلشن پر کیوں خفا ہو رہی ہو - مجھ سے پوچھو - لو، یہ ہے تمہارا تمام عاشور خانہ میری بغل میں ـــ مگر خدا کے لئے یہ تو بتادو کہ یہ چلہ کتنے دنوں کا ہے - تاکہ میں اتنے زمانہ کے لئے کہیں باہر چلا جاؤں"

(ثریا بیگم کی ہنسی کی آواز)

ثریا بیگم ــــ "خفا تو نہ ہوگے اگر سچ سچ کہدوں"

نظام علی — "یہ لو تمہاری جانماز، تسبیح اور قرآن سب اپنے سر پر رکھ کر کہتا ہوں کہ خفا نہ ہوں گا"

رباب بیگم — "اچھا تو وعدہ کیجیے کہ آیندہ آپ کبھی کوئی شعر نہ کہیں گے"

نظام علی — (سنجیدگی سے) "کیوں، کیا تمہیں میری شاعری سے تکلیف ہوتی ہے"

رباب بیگم — "تکلیف! یہ نہیں کہتے کہ کلیجہ پیپ ہو کر رہ گیا ہے"

نظام علی — "تمہیں تکلیف ہوتی ہے تو جانے دو۔ میں نے تو صرف تمہاری خوشی کے لئے شاعری شروع کی تھی، تم پسند نہیں کرتیں تو کیا میرا سر پھرا ہے کہ خواہ مخواہ اپنا وقت ان مہملات میں ضایع کروں"

رباب بیگم — "ہاں، میری خوشی ہو چکی اب میری مرضی یہی ہے کہ آپ اس سے توبہ کر لیں"

نظام علی — "اچھا، میں توبہ کرتا ہوں، لیکن تم بھی توبہ کرو کہ ——"

رباب بیگم — "خدا تمہیں شرمائے، نماز سے توبہ کراتے ہو جس نے تم سے شاعری کی لت چھوڑوائی"

نظام علی — "اور تم شاعری سے توبہ کراتی ہو جس نے تمہیں نماز کی عادت ڈلوائی"

(دونوں کا قہقہہ)

باجلاس مسٹر الیف-ایچ ٹیل صاحب بہادر سب جج درجہ چہارم چھاؤنی لاہور

مقدمہ لالہ خوشی رام ولد لالہ جمنول رام قوم نانگیہ پروپرائٹر گلوب بک ڈپو چھاؤنی لاہور........ مدعی

بنام

لٹر ڈی سنگھ ایم-بی-ڈی-ڈی-ایس معرفت سول سرجن صاحب کنگ جارج دی فورتھ سول ہسپتال بنارس چھاؤنی مدعاعلیہ

دعوےٰ دلاپانے مبلغ-۱-/7/247 روپیہ

مقدمہ مصدرہ میں ہماری تسلی ہو گئی ہے کہ مدعا علیہ دیدہ دانستہ تعمیل سمن سے گریز کرتا ہے اور معمولی طریقہ سے اس کی تعمیل سمن نہیں ہو سکے گی۔ لہذا بذریعہ اشتہار ہذا زیر آرڈر 5 رول 20 ضابطہ دیوانی مشتہر کیا جاتا ہے کہ اگر ڈاکٹر ڈی سنگھ مدعا علیہ مذکور تاریخ مقررہ مورخہ 17 4/1937 کو برائے پیروی مقدمہ اصالتاً یا وکالتاً حاضر عدالت ہذا نہ ہوگا تو اس کے برخلاف کارروائی یکطرفہ عمل میں لائی جائے گی۔

آج بتاریخ 6/3/37 ہمارے دستخط و مہر عدالت سے جاری ہوا۔

سب جج درجہ چہارم چھاؤنی لاہور

مہر عدالت

باب المراسلۃ والمناظرہ

(جناب سید علی اوسط صاحب - بنارس)

مکرمی - تسلیم - میں دیکھتا ہوں کہ آپ کا رجحان اخلاقیات میں مادی دنیا سے زیادہ روحانیات کی طرف ہے لیکن اسی کے ساتھ آپ حیات بعد الموت اور دوزخ وجنت وغیرہ سے بھی انکار کرتے ہیں، یہ اجتماع ضدین میری سمجھ میں نہیں آیا - براہ کرم اس گتھی کو سلجھائیے -

---

(نگار) گرامی جناب، آپ کی تحریر پڑھکر مجھے آپ پر بہت رحم آیا اور یہ معلوم کر کے سخت افسوس ہوا کہ مذہب کی کورانہ تقلید واقعی انسان کی قوت ادراک وفہم کو اسقدر بلید کردیتی ہے کہ سیاہ وسفید کا امتیاز بھی اسمیں باقی نہیں رہتا - آپ نے مادی دنیا اور روحانیات کے الفاظ توضرور اپنی تحریر میں استعمال کئے ہیں، لیکن معاف فرمائیے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آپ ان دونوں کے صحیح مفہوم سے بے خبر ہیں، اور اس لئے میرے متعلق آپ کا یہ ارشاد کہ میرا رجحان بہ نسبت مادیات کے روحانیات کی طرف زیادہ ہے، سوائے اس کے کہ اسے حسن ظن سے تعبیر کروں اور کیا کہہ سکتا ہوں - دیکھئے میں آپ کو نہایت ہی آسان طریقہ سے ان دونوں کا فرق بتاتا ہوں، اسے یاد رکھئے اور آئندہ جب ان الفاظ کو استعمال کیجئے اس کو کبھی نہ بھولئے -

مادیات وروحانیات فی الاصل کیا چیز ہیں، اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں، آپ تو اتنا سمجھ لیجئے کہ دنیا میں دو چیزیں ہیں ایک وہ جنھیں ہم حواس ظاہری سے محسوس کرتے ہیں مثلاً پھول کہ آپ اسے دیکھ سکتے ہیں، سونگھ سکتے ہیں، چھو سکتے ہیں یا آواز جس کا احساس آپ کو سامعہ کے ذریعہ سے ہوتا ہے، دوسری چیز وہ جس کا تعلق احساس ظاہری سے نہیں ہے بلکہ صرف کیفیت ووجدان سے ہے مثلاً کیفیت مسرت وغم کہ نہ اسے ہم دیکھ سکتے ہیں نہ چھو سکتے ہیں - اب آپ خود غور فرمائیے کہ حشر ونشر، جنت ودوزخ وغیرہ کا عقیدہ روحانیات سے متعلق ہے یا مادیات سے - یعنی ان باتوں کو تسلیم کرنے کے بعد آپ کی مادہ پرستی ثابت ہوتی ہے یا ان کے انکار کے بعد میری مادہ پرستی -

فرض کیجئے میں کہتا ہوں کہ مرنے کے بعد انسان نسیاً منسیا ہوجاتا ہے یا یہ کہ اگر روح باقی بھی رہتی ہے تو مذہب کے بتائے ہوئے عذاب و ثواب سے اس کا تعلق نہیں ہوتا۔ اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ اس عقیدہ میں مادیت کا لگاؤ کہاں ہے۔ برخلاف اس کے آپ اپنے معتقدات کو ملاحظہ کیجئے کہ:-

۱- آسمان سے ایک فرشتہ (عزرائیل) آتا ہے اور وہ روح کو جسم سے نکالکر آسمان کی طرف لیجاتا ہے۔

۲- جب مردہ قبر میں دفن کیا جاتا ہے تو روح پھر جسم کے اندر واپس کردیجاتی ہے (معلوم نہیں وہ قومیں جو اپنے مردوں کو جلاکر ان کی خاکستر منتشر کردیتی ہیں ان کی روح پھر کیونکر جسم میں واپس کی جاتی ہوگی، غالباً ان کے تمام منتشر اجزاء کو جمع کرکے پہلے جسم بنایا جاتا ہوگا اور پھر روح اس کے اندر داخل ہوتی ہوگی)

۳- قبر کے اندر دو فرشتے (منکر و نکیر) آتشیں گرز لئے ہوئے داخل ہوتے ہیں اور مردہ کو بٹھاکر خدا اور رسول کے متعلق سوال کرتے ہیں، اگر اس نے جواب معقول دیا یعنی اگر وہ مسلمان ثابت ہوا تو کیا کہنا ورنہ پھر غریب کی شامت آجاتی ہے اور گرز بازی شروع ہوجاتی ہے (گویا سوائے مسلمانوں کے اور جتنی مخلوق خدا نے پیدا کی ہے وہ صرف جہنم میں جھونکنے کے لئے)

۴- حشر کے دن تمام مردے اپنے اپنے اصلی جسموں کے ساتھ اٹھیں گے، ان کے ہاتھ میں ان کے نامۂ اعمال ہونگے پُل صراط سے گزریں گے اور میزان میں ان کے اعمال تولے جائیں گے۔

۵- اگر جنت کے قابل سمجھے گئے تو وہاں انھیں کھانے کو عمدہ عمدہ پھل ملیں گے، رہنے کو سونے چاندی کے مکان، اور خواہش نفسانی پوری کرنے کے لئے حور و غلمان۔

۶- اگر دوزخ نصیب ہوئی تو وہاں سانپ بچھو انھیں ڈسیں گے، کھولتا ہوا پانی انھیں پینا پڑے گا، آگ میں جلتے رہیں گے اور خدا جانے کس کس طرح کی جسمانی سزا انھیں دیجائے گی۔

اب غور فرمائیے کہ مرنے کے بعد آپ جس عالم کے قایل ہیں اس کا تعلق مادیات سے ہے یا روحانیات سے یعنی اس میں کمیت پائی جاتی ہے یا کیفیت۔ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی جزو ایسا نہیں ہے جس میں مادیت و جسمانیت نہ پائی جائے اور زمان و مکان سے اس کا تعلق نہ ہو۔ گرز، میزان، پُل صراط، سانپ، بچھو، حور، قصور وغیرہ کا غیر مادی تصور محال ہے اور تاوقتیکہ آپ انھیں محسوس و مرئی چیز نہ مانیں آپ کے جنت و دوزخ کا تخیل پورا ہو ہی نہیں سکتا۔ اب اس کے مقابلہ میں آپ میرے اعتقاد کو دیکھئے کہ وہاں ان میں سے کسی چیز کو درخور حاصل نہیں ہے بلکہ وہ صرف کیفیت و وجدان یا احساس محض سے متعلق ہے۔ پھر آپ ہی انصاف فرمائیے کہ روحانیات کا قایل میں ہوں یا آپ، مادہ پرستی آپ کے اسلام میں پائی جاتی ہے یا میرے اسلام میں۔

خیال کن تو کجائی و ما کجا واعظ!

باب الاستفسار

جعفر و عباسہ کا نکاح - زوال برامکہ

(جناب عطا کریم صاحب - ضلع شاہ آباد)

۱- خاندان برامکہ کے زوال و استیصال کے اسباب کیا تھے۔

۲- جعفر و عباسہ کے نکاح اور اولاد ہونے کا واقعہ صحیح ہے یا محض افسانہ، ہارون الرشید خلیفۂ بغداد کے عادات و اطوار کیسے تھے؟

(نگار) عباسہ کا نکاح جعفر کے ساتھ بہت مشہور چیز ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کی حقیقت افسانہ سے زائد نہیں اس کا سب سے پہلا راوی طبری ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ہارون الرشید اپنے وزیر جعفر برمکی اور اپنی بہن عباسہ سے حد درجہ مانوس تھا اور کسی وقت ان سے جدائی پسند نہ کرتا تھا، لیکن چونکہ یہ دونوں غیر محرم تھے اس لئے دونوں کا پردہ توڑنے کے لئے اس نے ان کا نکاح کر دیا مگر شرط یہ قرار دی کہ خلوت میں ایک دوسرے سے نہ ملنے پائیں (یہ شرط غالباً اس لئے تھی کہ مبادا تعلقات زن و شو، خلافت کو برمک خاندان میں منتقل کر دیں) لیکن اس کی پابندی نہ ہو سکی اور آخرکار مکہ میں عباسہ کے ایک لڑکا (اور بہ روایت دیگر دو توام بچے) پیدا ہوئے۔ اسی زمانہ میں جب ہارون الرشید مکہ پہونچا تو کسی کنیز نے یہ خبر اس کو پہونچا دی اور اس نے جعفر سے انتقام لینے کا ارادہ کر لیا، چنانچہ محرم ۱۸۷ھ میں اس نے دفعتہً جعفر کو قتل کرا دیا۔

یہ ہے روایت طبری کی جس کو اس نے صرف افواہاً نقل کیا ہے اور اس سے قبل کی کسی تاریخ میں اس کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ اس واقعہ کی غلطی کا ایک اور ثبوت ہے۔ وہ یہ کہ عباسہ کی تین شادیاں پہلے ہو چکی تھیں اور اس کے تینوں شوہر مر چکے تھے، چنانچہ عرب کے مشہور شاعر ابو نواس نے عباسہ کے متعلق چند طنزیہ اشعار لکھے جس میں یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر خلیفہ کسی باغی کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا ہے تو چاہئے

کہ عباسہ سے شادی کر دے، کیونکہ اس صورت میں اس کی موت یقینی ہے۔ ابونواس نے اس سلسلہ میں عباسہ کے ان تینوں شوہروں کا بھی نام لکھا ہے اور جعفر کا ذکر اس میں کہیں نہیں ہے۔

علاوہ اس کے جس وقت جعفر کے ساتھ عباسہ کی شادی کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے اس وقت عباسہ کی عمر ۴۹ سال کی تھی اور ظاہر ہے کہ اس عمر میں جوانی کے وہ ولولے جو اسے جعفر کی مواصلت کے لئے بے اختیار کر دیتے کہاں سے پیدا ہو سکتے تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ واقعہ کیوں مشہور ہو گیا۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جاہلیت عرب میں وہاں کے داستان گویوں کا عام میلان یہ تھا کہ جب کسی بادشاہ کا ذکر کرتے تھے تو وزیر سے اس کی بہن کا تعلق ازدواج یا رشتۂ محبت ضرور دکھاتے تھے۔ اور ان کی یہی وہ ذہنیت تھی جس نے عباسہ (ہارون الرشید کی بہن) اور جعفر (وزیر) کے معاشقہ کا اختراع کر کے قتل جعفر کی داستان کو رنگین بنا کر پیش کر دیا۔ اور کسی ایسی ہی داستان کو طبری نے درج کر کے بعد کے مورخین کے لئے اس کے نقل و روایت کا دروازہ کھول دیا۔ طبری کے بعد کے مورخین میں سب سے پہلے ابن خلدون نے اس پر انتقادی نگاہ ڈالی اور اسے ناقابل اعتماد قرار دیا۔

برامکہ کے زوال کا سبب عباسہ کے نکاح کو قرار دینا سخت غلطی ہے، کیونکہ اول تو اس کی صحت بہت مشتبہ ہے اور اگر اسے صحیح مان لیں تو بھی اس کو صرف بہانہ قرار دے سکتے ہیں نہ کہ اصل سبب۔

حقیقت یہ ہے کہ برامکہ کا غیر معمولی اقتدار ہی ان کے زوال کا باعث ہوا۔ آپ برامکہ کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ خالد، یحییٰ اور جعفر تینوں اپنے اپنے زمانہ میں خاص اقتدار رکھتے تھے، خالد نے خلیفہ ابوالعباس اور خلیفہ منصور کے زمانہ میں جو اہمیت حاصل کی وہ تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں سے پوشیدہ نہیں۔ اور اس کے بیٹے یحییٰ کو جو عظمت خلیفہ ہادی اور ہارون الرشید کے عہد میں حاصل تھی وہ بھی سب پر ظاہر ہے، اسی طرح جعفر کو جو عروج ہارون الرشید کے زمانہ میں میسر آیا وہ بھی سب کے علم میں ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ جعفر اپنے باپ یحییٰ اور اپنے دادا خالد کی طرح اچھا گورنر ثابت نہ ہوا، اس میں شک نہیں کہ وہ بڑا اچھا خطاط تھا، نہایت بے مثل خطیب تھا، علم نجوم میں ماہرانہ درک رکھتا تھا اور وضع کی تراش خراش کا بھی خاص ذوق رکھتا تھا، لیکن ایک سیاست داں امیر یا حاکم کی حیثیت سے وہ ناکام شخص تھا۔ متعدد بار بڑے بڑے صوبوں کا چارج اس کو دیا گیا، لیکن اس نے ہمیشہ اپنے نائبوں پر سارا کام چھوڑ دیا اور کبھی اپنے فرائض صحیح طور پر انجام نہیں دئے۔ اس کو ہارون الرشید اچھی طرح جانتا تھا، چنانچہ جعفر کے خلاف فضل بن ربیع کی کامیابیاں اس کی بخوبی شاہد ہیں۔ اسی کے ساتھ دوسری بات جو ہارون کے دل میں کھٹک رہی تھی برامکہ

کی عجم پرستی تھی اور اسے اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ کہیں خلافت وحکومت بنو عباس کے ہاتھ سے نکل کر ایرانیوں کے قبضہ میں نہ چلی جائے۔ چنانچہ عربوں نے اس کا کافی پروپیگنڈا بھی کیا اور برامکہ کو ملحد و کافر تک ثابت کر دکھایا۔ چنانچہ ابن قتیبہ نے عیون الاخبار میں اصمعی کی ایک نظم نقل کی ہے جس میں لکھا ہے کہ "جب کسی محفل میں اسلام کے مخالف کوئی بات کہی جاتی ہے تو برامکہ کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھتا ہے اور جب قرآن کی کوئی آیت انکے سامنے پڑھی جاتی ہے تو وہ صحیفۂ مزدک کی کہانیاں سنانے لگتے ہیں"۔ بیان جاحظ اور عیون الاخبار میں ایک اور شاعر کی طنزیہ نظم درج ہے جس میں وہ لکھتا ہے کہ "تعمیر مساجد سے دلچسپی لینا تو صرف میری تفریح ہے ورنہ فی الحقیقت میں ان کی طرف سے ایسا ہی بے پرواہ ہوں جیسے یحییٰ بن خالد"۔

کہا جاتا ہے کہ خلیفہ منصور نے خود خالد وزیر سے صاف صاف کہدیا تھا کہ "تم ایرانیوں کی بہت طرفداری کرتے ہو"۔ اور خلیفہ ہادی نے (حسب بیان طبری) یحییٰ (جعفر کے باپ) کو کھلم کھلا کافر کہہ ہی دیا تھا۔

اسی طرح ہارون الرشید نے بھی محسوس کیا کہ برامکہ کا اقتدار نہ صرف بنو عباس بلکہ اسلام کے لئے خطرہ کا سبب ہے اور آخر کار وہ اس کے استیصال پر آمادہ ہوگیا۔ ہوسکتا تھا کہ وہ جعفر کو معزول کرکے اس کے باپ بھائی کی طرح اس کو بھی مقید کر دیتا، لیکن چونکہ ہارون الرشید انتہا پسند شخص تھا اور ہر بات میں وہ انتہائی تکمیل چاہتا تھا اس لئے اس نے سوچا کہ جعفر کا ہلاک کر ڈالنا ہی مناسب ہے، کیونکہ بصورت دیگر وہ سمجھتا تھا، ممکن ہے اسے پھر رحم آجائے۔ (کیونکہ وہ واقعی اس سے بہت محبت کرتا تھا)۔

ہارون الرشید کا زمانہ نہ صرف عہد بنی عباس بلکہ عہد اسلام کا دور زریں کہلاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ جو عظمت و جبروت، سطوت و جلالت اس کو حاصل ہوئی وہ اس سے پہلے خلفاء عرب میں کسی کو میسر نہیں آئی۔ اس کے بعد تو خیر زوال ہی شروع ہوگیا تھا۔

وہ علوم و فنون کا بڑا زبردست مربی تھا اور اس کے دربار میں ہر وقت علماء عصر حاضر رہتے تھے، علمی مباحث سے اسے خاص دلچسپی تھی اور فنون لطیفہ کا بھی اسے خاص ذوق حاصل تھا، شان و شوکت کا وہ عالم تھا کہ اکاسرۂ عجم کی داستانیں بھی ماند پڑگئی تھیں اور بذل و کرم کی وہ کیفیت تھی کہ جس کی طرف توجہ ہوگئی اسے بے نیاز کر دیا۔

وہ نہایت خوش خلق، ہنس مکھ اور رحیم المزاج انسان تھا۔ اور کبھی کسی پر ظلم کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اسی کے ساتھ میدان جنگ میں وہ ایک سپہ سالار بھی تھا اور عربی شہامت و بسالت کے پورے جوہر دکھاتا تھا۔ اس کے پورے دور حکمرانی میں صرف قتل جعفر کا ایک ایسا واقعہ ہے جسے ظلم و ستم سے تعبیر کیا جاسکتا

ہے۔ لیکن اگر اس وقت کی سیاسیات پر غور کیا جائے تو ہارون الرشید کا جُرم ہلکا نظر آئے گا۔

قبرص ــــ اقریطش

(جناب اسلام علی خانصاحب۔ گوجرانوالہ)

اگر زحمت نہ ہو تو کریٹ اور سائپرس سے متعلق تاریخ اسلام پر روشنی ڈالئے۔ ممنون ہوں گا۔

(نگار) سائپرس (CYPRUS) جسے عربی میں قُبرُص یا قُبرُس اور ترکی میں قبرس کہتے ہیں، ایک جزیرہ ہے بحر روم کے مشرق میں۔ ایام قدیم میں جب شام و مصر کے درمیان بحری سفر کیا جاتا تھا تو تمام جہاز اسی جزیرہ سے ہو کر گزرتے تھے، چنانچہ اسی طرح رفتہ رفتہ وہ تجارتی مرکز اور مصری و شامی تہذیب کا سنگم بن گیا تھا تانبا یہاں کی خاص پیداوار تھی اور اسی لئے اسے قُبرُس کہنے لگے (عربی میں اچھے تانبے کو قبرس کہتے ہیں)

جب اسلام کی فتوحات وسیع ہونے لگیں تو یہ جزیرہ بازنطینی حکومت کے قبضہ میں تھا اور سب سے پہلے امیر معاویہ نے ۲۸ھ میں فوجی مہم یہاں روانہ کی اور بجائے بازنطینی حکومت کے مسلم حکومت کا باجگزار بن گیا۔ کہا جاتا ہے کہ عبادہ بن الصامت کی بیوی ام حرام اسی مہم میں شہید ہوئی تھیں اور ان کا مقبرہ اب بھی زیارتگاہ عام ہے۔ بلاذری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۳۳ھ میں دوسری فوجی مہم یہاں روانہ کی گئی اور زیادہ استحکام کے ساتھ مسلمانوں کی حکومت یہاں قائم ہوئی۔ لیکن امیر معاویہ کے بعد ان کے جانشین یزید نے اس جزیرہ سے اپنا قبضہ اٹھا لیا اور اس کا خراج عرب اور بازنطینی حکومت میں برابر تقسیم ہو گیا۔ الغرض عہد بنی امیہ میں اس پر مستقل قبضہ کبھی مسلمانوں کا نہیں ہوا اور اس طرح اس کی حیثیت ایک طور سے خود مختارانہ قائم رہی سوائے اس کے کہ وہ بازنطینی حکومت اور عربوں کو خراج ضرور ادا کرتا تھا۔ پھر چونکہ یہاں کی آبادی عیسائیوں کی تھی اس لئے قدرتاً انھیں بازنطینی حکومت سے زیادہ دلچسپی تھی اور اسی کی اخلاقی حکومت یہاں قائم تھی۔ عہد عباسیہ میں مسلمانوں کی گرفت اس جزیرہ پر اور زیادہ ڈھیلی ہو گئی اور ہر چند ہارون الرشید کے زمانہ میں اور اس کے بعد بھی فوجی مہمیں یہاں روانہ کی گئیں لیکن مستقل قبضہ کا خیال کبھی نہیں کیا گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ بازنطینی اقتدار یہاں بہت بڑھ گیا۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس جزیرہ کو تجارتی مرکزیت حاصل تھی اور عرب و عیسائی حکومتوں کے جہاز یہاں لنگر انداز ہوا کرتے تھے، سوا اس کے یہ

حیثیت بدستور قایم رہی اور سوائے اس کے کہ جس حکومت کا زیادہ اقتدار ہوتا تھا اس کے جنگی جہاز بھی یہاں رہتے تھے اور کوئی فرق کبھی پیدا نہیں ہوا۔

نائس فورس فوکس (NICEPHOROS PHOCS) کے بعد جس نے سنہ ۹۶۳ء سے ۹۶۹ء تک یہاں حکومت کی یہاں پھر بازنطینی حکومت کا قبضہ ہوگیا۔

اس کے بعد جب سنہ ۱۱۹۱ء میں رچارڈ اول کا جنگی بیڑہ ادھر سے گزرا تو اسحاق نامی ایک شخص یہاں حکمراں تھا۔ رچارڈ نے اس جزیرہ کو فتح کرکے ٹمپلرس کے ہاتھ فروخت کردیا اور انھوں نے لوسگنان کے گائیڈ کو دیدیا۔ اور ۴۰۰ سال تک یہاں فرنگیوں کی سلطنت قایم رہی۔ اس دوران میں یہاں بڑے بڑے گرجا اور قلعے تعمیر کیے گئے۔ یہ حکومت صلیبیین کی بڑی معاون تھی اور مصر و شام کی مملوک حکومت کے پہلو میں یہ زبردست خار کی حیثیت رکھتی تھی۔

مملوک حکومت کے بانی بیبرس اول نے ۶۶۹ھ (۱۲۷۰ء) میں ایک بیڑہ روانہ کیا لیکن یہ تباہ ہوگیا اس کے بعد وسط پندرھویں صدی عیسوی میں مملوکوں نے زیادہ اہتمام کے ساتھ اپنی گزشتہ شکست کا انتقام لینا چاہا اور متعدد لڑائیوں کے بعد مسلمانوں نے اس جزیرہ کو مفتوح کرلیا، لیکن مستقل قبضہ اب بھی نہیں کیا اور وہی باجگزارانہ حیثیت اس کی قایم رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں پھر مقامی حکومت برسر اقتدار ہوگئی۔ اور لڑائیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

اس کے بعد ترکوں کے زمانہ میں سلطان سلیم ثانی نے اس کو مفتوح کرنا چاہا اور آخر کار ترکی حکومت کا یہاں اعلان ہوگیا اور سنہ ۱۸۷۸ء تک برابر ان کا قبضہ یہاں قایم رہا۔ اس کے بعد جب اسی سال انگریزوں اور ترکوں کے درمیان معاہدہ ہوا تو یہ جزیرہ انگریزوں کے سپرد کردیا گیا اور برائے نام ترکوں کا اقتدار یہاں باقی رہا۔ چنانچہ اب یہ جزیرہ بالکل انگریزوں کے قبضہ میں ہے اور خوب آباد ہے۔

کریٹ (CRETE) کو عربی میں اقریطش کہتے ہیں۔ مسلمانوں نے اول اول جب بازنطینی حکومت سے جنگ شروع کی تو اسی سلسلہ میں اس جزیرہ پر بھی ان کا قبضہ ہوگیا (سنہ ۶۷۳ء) لیکن اس زمانہ کی تاریخ تقریبًا تاریکی میں ہے اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ قبضہ عارضی تھا۔ اس کے بعد سنہ ۸۲۵ء میں ابوحفص عمر بن عیسیٰ بن شعیب مستقلاً اس پر قابض ہوگیا۔ ابوحفص اس جماعت کا سردار تھا جس نے قرطبہ کے فرمانروا حکم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا اور جو شکست کھاکر بحر روم کے سواحل پر قزاقانہ حملے کیا کرتا تھا۔

ہرچند بازنطینی حکومت نے بہت کوشش کی کہ وہ پھر قابض ہوجائے لیکن برابر ۱۳۵ سال تک

مسلمانوں کا قبضہ اس پر قایم رہا۔ یہاں انھوں نے ایک نیا دارالحکومت بھی خندق کے نام سے تعبیر کیا جو بعد کو کنڈیا (CANDIA) ہوگیا اور رفتہ رفتہ سارا جزیرہ اسی نام سے موسوم ہوگیا۔

۹۶۱ء میں نے بازنطینی جنرل نے کئی ماہ کے محاصرہ کے بعد اس جزیرہ کو فتح کرلیا۔ یہاں آخری مسلمان امیر (عبدالعزیز) قسطنطنیہ قید کرکے بھیجدیا گیا اور وہیں اس کا انتقال ہوا۔ قسطنطنیہ اسوقت تک مسلمانوں کے قبضہ میں نہ آیا تھا اور بازنطینی حکومت کا پایۂ تخت تھا۔

اس کے بعد جب قسطنطنیہ کو لاطینیوں نے فتح کیا، تو کریٹ ۱۲۰۴ء میں (VENETIANS) کے ہاتھ فروخت کردیا گیا۔

اس کے بعد جب ترکوں کی فتوحات وسیع ہوئیں تو ادھر بھی انھوں نے توجہ کی اور آخرکار اس جزیرہ کا بڑا حصہ ۱۶۶۹ء میں ترکوں کے قبضہ میں آگیا اور ۱۷۱۵ء تک پورا جزیرہ ان کی حکومت میں شامل ہوگیا۔ ہر چند اس جزیرہ کی مدافعت میں تمام مغربی حکومتوں نے حصہ لیا تھا لیکن ترکوں کے مقابلہ میں وہ کامیاب نہ ہوسکے۔

اس جزیرہ میں ترکوں کے قبضہ کے وقت بالکل عیسائی آبادی پائی جاتی تھی۔ لیکن بعد کو فاتح قوم کا مذہب بھی بہت سے عیسائیوں نے اختیار کرلیا اور ان کا اقتدار اسقدر بڑھ گیا کہ حکومت بھی پریشان ہوگئی اور باوجود متعدد کوششوں کے ان کی بغاوتوں کو فرو نہ کرسکی۔

۱۸۳۰ء میں جب لندن کانفرنس نے یونان کی آزادی و خودمختاری کو تسلیم کیا تو خیال تھا کہ یہ جزیرہ بھی اسی کو دیدیا جائے لیکن ایسا نہیں ہوا اور محمد علی پاشا (حاکم مصر) کو دیدیا گیا جسے ترکوں نے اپنی مدد کے لئے طلب کیا تھا۔ اس طرح ترکوں کا تعلق اس جزیرہ سے بدستور قایم رہا لیکن مقامی بغاوتوں کا سلسلہ بھی اسی طرح جاری رہا اور بمشکل تمام کافی قربانیوں کے بعد ۱۸۶۹ء میں یہاں امن و سکون قایم ہوسکا۔

جب ۱۸۷۸ء میں جنگ روم و روس ہوئی تو یہاں پھر بغاوت شروع ہوگئی اور سلطنت گورنمنٹ اس کو ملگئی، لیکن یہ تدبیر بھی مفید ثابت نہ ہوئی اور بدامنی کا دور دورہ برابر قایم رہا اور آخرکار دول یوروپ نے مداخلت کرکے ترکوں کی حکومت کا یہاں بالکل خاتمہ کردیا۔

زہرِ عشق

مصنفۂ مرزا شوق لکھنوی۔ مرتبہ جناب مجنوں گورکھپوری معہ مقدمہ جناب نیاز صاحب فتحپوری و مولانا عبدالماجد صاحب مجلد مع تین رنگین تصاویر کے۔ قیمت عمر، علاوہ محصول۔ منیجر نگار لکھنؤ

عجائب وغرائب

بائیس سال قبل سامان حرب پر جتنی رقم صرف ہو رہی تھی وہ بھی غیر معمولی تھی لیکن اب باوجود داعی صلح کوشی جو کچھ صرف ہو رہا ہے اسے بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

	سنہ ۱۴ء		سنہ ۳۶ء	
برطانیہ	۱۰۳۰۰۰۰۰۰۰	روپیہ	۱۳۳۰۰۰۰۰۰۰	روپیہ
امریکہ	۴۷۰۰۰۰۰۰۰	"	۱۹۵۰۰۰۰۰۰۰	"
فرانس	۹۶۰۰۰۰۰۰۰	"	۱۹۲۰۰۰۰۰۰۰	"
جرمنی	۱۲۷۰۰۰۰۰۰۰	"	۹۹۰۰۰۰۰۰۰	"
اطالیہ	۵۰۰۰۰۰۰۰۰	"	۹۶۰۰۰۰۰۰۰	"
جاپان	۲۶۰۰۰۰۰۰۰	"	۷۴۰۰۰۰۰۰۰	"

اسوقت دنیا میں ۲ کروڑ بچے (جن کی عمر ۶ سال سے ۲۰ سال تک کی ہے) جنگ کی تعلیم پا رہے ہیں) بعض قومیں ۵ سال کی عمر ہی سے فوجی تعلیم شروع کر دیتی ہیں اور بعض تین سال کی عمر ہی میں جنگی جھنڈا بچوں کے ہاتھ میں دیدیتی ہیں تاکہ ان کے اندر کھیل کا ذوق بھی جنگ ہی کے جذبہ سے شروع ہو۔

گزشتہ جنگ ختم ہونے کے بعد فرانس کی حکومت نے ایک محکمہ قایم کر دیا تھا تاکہ ان بموں کو زمین کے اندر ڈھونڈھے جو چھٹنے سے رہ گئے تھے۔ چنانچہ گزشتہ ۱۸ سال سے یہ کام جاری ہے اور گاڑیوں پر گاڑیاں ان بموں کی بھیجی جا رہی ہیں۔ پچھلے چھ سال میں ۵۰۰۰ ۴ ٹن وزن کے بم زمین سے نکال کر حکومت کے پاس ضایع کرنے کے لئے بھیجے جا چکے ہیں اور ۱۶۷۰۰۰ وزن کے بھاری بم جو منتقل نہ ہو سکتے تھے وہیں ضایع کئے جا چکے ہیں۔ اس سے گزشتہ جنگ کی ہولناکیوں کا اندازہ کرنا چاہئے۔

شنگھائی کے ہانگ کانگ بنیک کے پھاٹک پر پیتل کے دو شیر نصب کئے گئے ہیں، لیکن گزشتہ دس سال کے اندر واہمہ پرست چینیوں نے ان شیروں کے پنجوں کو اسقدر مس کیا کہ اب وہ بالکل گھس گئے ہیں۔ چینیوں کا خیال ہے کہ یہ شیر بہت متبرک ہیں اور جو شخص ان کو چھو لیتا ہے اس کو بہت فلاح ہوتی ہے۔

تخت برطانیہ پر جب کوئی نیا بادشاہ بیٹھتا ہے تو تاج میں اسکے سر کے مطابق ضرور تبدیلی کی جاتی ہے۔

روسیوں نے اپنی داڑھیاں اُڑا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے اور ۱۵۰۰ اجسام اس کام کے لئے زیر تربیت ہیں۔

حال ہی میں ایک جراثیم کش سرد شعاع دریافت ہوئی ہے جو عمل جراحی کے وقت مریض کے آس پاس ڈالی جاتی ہے اور اس سے فضا میں اُڑنے والے جراثیم از خود فنا ہو جاتے ہیں۔

جاپان کی آبادی ۱۹۳۵ء میں اتنی بڑھ گئی ہے کہ دنیا کا کوئی ملک اس اضافہ میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، یعنی وہاں فی گھنٹہ ۲۴۰ پیدائش کا اور ۱۳۳ اموات کا اوسط پڑتا ہے۔ اسوقت جاپان کی آبادی سات کروڑ کے قریب ہے۔

کاغذ کی برساتیاں جنھیں کوئی خاص تیل ملکر طیار کیا جاتا ہے جاپان کے اندر بارہ بارہ آنے میں فروخت ہو رہی ہیں۔ انکو لپیٹ کر نہایت چھوٹے پیکٹ میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ نہ ان میں شکن پڑتی ہے اور نہ وہ آسانی سے پھٹتی ہیں۔

اندازہ کیا جاتا ہے کہ دنیا نصف سے زیادہ جاہل ہے اور تعلیم کی موجودہ رفتار کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ ہزار سال کے بعد بھی یہی حال رہیگا، کیونکہ پیدائش جتنی جلد ہوتی ہے اتنی جلد تعلیم تو نہیں ہو سکتی۔

رنگون اور برما کے محکمۂ ڈاک نے وہاں کی پبلک سے درخواست کی ہے کہ براہ کرم آیندہ ڈاک کے ذریعہ سے انسانی سر نہ بھیجا کریں۔ وہاں دشمن کا سر کاٹ کر اس کے عزیزوں کے پاس بھیجنے کی رسم عام ہے۔

ٹریسٹ (اٹلی) میں ایک شخص درد معدہ کا مریض تھا۔ حال ہی میں اسکے پیٹ کا آپریشن ہوا تو اندر سے جو کچھ دستیاب ہوا اسکی فہرست ملاحظہ ہو۔ تیرہ کنجیاں۔ ایک بٹن کا ڈبہ کھولنے والا آلہ، تین سگار ہولڈر، تیرہ پنسلیں، پانچ فاؤنٹن پن، ایک چمچہ، دو پنسل ہولڈر، چار قلم تراش، ایک سیفٹی ریزر کا دستہ، چند سوئیاں، ایک ٹکڑا کانچ کا اور پانچ سکے۔

افزائش حسن کے آلات میں ایک اور آلہ کا اضافہ حال ہی میں ہوا ہے، یہ تار کا حلقہ ہے جو ساری رات چہرہ پر چڑھا رہتا ہے اور صبح تک دونوں گالوں میں ہلکے سے گڑھے پیدا کر دیتا ہے۔

سرعت رفتار کے تازہ ترین اعداد و شمار یہ ہیں:۔ کشتی ۱۲۴ میل فی گھنٹہ۔ موٹر ۳۰۱ میل فی گھنٹہ۔ ہوائی جہاز ۴۲۴ اور بندوق کی نئی گولی ۳۶۰۰ میل فی گھنٹہ۔

جرمنی کے ڈاکٹر اڈانف نے منجمد پٹرول طیار کیا ہے جسے SOLENE کہتے ہیں۔ یہ دیکھنے میں پنیر کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے اور ہوائی جہازوں اور موٹروں میں موم بتی کی طرح جلتا ہے، یہ رقیق پٹرول سے بہتر کام دیتا ہے۔

نیویارک میں اسوسی ایٹڈ ہاسپٹل سروس کے نام سے ایک تنظیم قایم ہے جو فی گھر ساڑھے تین آنے روزانہ لیکر ۱۸ سال سے کم عمر کے تمام لڑکوں کا علاج مفت کرتی ہے اور دوائیں وغیرہ بھی اپنے پاس سے فراہم کرتی ہے۔ پھر یہ سب کچھ خیرات کے سلسلہ میں نہیں ہوتا۔ یہ تنظیم اپنے مصارف خود پورے کر لیتی ہے۔

امریکہ کے بعض مقامات میں ٹڈے بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور کھیتوں کو کھا جاتے ہیں۔ ایک کسان نے تین ترکی مرغیاں لیں اور شام کو کھیت میں چھوڑ دیا تاکہ وہ ان کیڑوں کو کھا جائیں، لیکن صبح کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ تینوں مرغیاں بالکل بے بال و پر تھیں۔

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

ترغیباتِ جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جسمیں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دُنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔

قیمت تین روپیہ (سہ عہ) علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم۔

مجموعۂ استفسار و جواب دو جلد

ان دونوں جلدوں میں ۲۲ء سے لیکر ۲۹ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان دونوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسائل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصری سائکلوپیڈیا کی ہے قیمت فی جلد تین روپیہ (سہ عہ) علاوہ محصول

خریداران نگار سے فی جلد ایکروپیہ کم۔

جذباتِ بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت علاوہ محصول بارہ آنہ (۱۲ر)

خریداران نگار سے تین آنہ (۳ر) کم

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:۔

۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

۲۔ مادئین کا مذہب۔

۳۔ حرکت کے کرشمے۔

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت: ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴ر) کم

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حُسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰ر)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے دو آنہ (۲ر) کم

فراستُ الید

مؤلفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات صحت و بیماری۔ شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴ر) کم

مذاکراتِ نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کردینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنے (۱۲ر)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے تین آنہ (۳ر) کم

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیائے تہذیب و شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اُردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (عار)

علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

SHAHI

REG.

BEST TONIC FOR GENERAL DEBILITY

SPECIFIC FOR :-
anaemia,
asthma,
tuberculosis,
&
female troubles,

جملہ اقسام کے یونانی مرکبات
صحیح اور پورے اوزان
سے تیار شدہ حاصل کرنا
چاہتے ہیں تو

فہرست دواخانہ

مُفت طلب فرمادیں

دماغی اور اعصابی کمزوری

کے لئے "شاہی" لاجواب اور دماغی کام کرنے والے اصحاب کے لئے بے نظیر تحفہ ہے۔
خون کی کمی (انیمیا) کو دفع کرنے اور خون کی افزایش کے لئے "شاہی" کو دنیا کی تمام ادویات پر
فوقیت حاصل ہے کیونکہ افزائش خون کے تمام اجزا اس میں موجود ہیں۔
دمہ و کھانسی اور سل و دق کے لئے نہایت مفید ہے۔
عورتوں کے جملہ امراض ہسٹریا (اختناق الرحم) لیوکوریا (سیلان الرحم) عام جسمانی کمزوری کے
دفع کرنے میں "شاہی" بجد مُفید ثابت ہوئی ہے۔
مزید معلومات کے لئے ہفت رنگین رسالہ مفت طلب کریں

طیبی دواخانہ یونانی

چوک بازار اندور شہر
تار کا پتہ "شاہی" اندور

۶۶ محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳
ٹیلیفون نمبر ۲۶۹۸۳